مبارک ہیں وہ......

انسان ایک ایسی دنیا میں جیتے ہیں جہاں سب سے زیادہ قابل ذکر ہستی اللہ رب العالمین کی ہے۔مگران کے ہاں سب سے کم اسی کی ہستی زیر بحث آتی ہے۔ یہ وہ سب سے بڑا المیہ ہے جو آسمان کے نیچے اور زمین کے اوپر رونما ہو رہا ہے۔اور شاید اس وقت تک ہوتا رہے گا جب تک عالم کا پروردگار ان آسمان وزمین کو ایک نئے آسمان وزمین سے نہیں بدل دے گا۔

ہمیں وجود دینے سے لے کر ہر لمحہ ہماری آتی جاتی سانسوں تک، ہمارے دل کی دھڑکن سے لے کر ہمارے رزق وروزگار تک، ہمارے لیے روشن سورج سے لے کر ہوا، پانی اور خوراک تک کے ہر چھوٹے بڑے معاملے کا کلی انحصار اللہ کی کرم نوازی اور عطا پر ہے۔

ہونا تو یہ چاہیے کہ جو رب ہماری زندگی میں اس درجہ دخیل ہے، ہم ہر لمحہ اس کی حمد، تسبیح اور تعریف کرتے رہیں۔جس کے ہاتھ میں ساری بھلائی اور جو ہر شر سے بچانے کی طاقت رکھتا ہے، ہم ہر لحظہ اس کے سامنے سراپا التجا بنے رہیں۔مگر حیرت انگیز طور پر انسان جو خوردبین اور دوربین سے ناقابل مشاہدہ دنیا کو بھی دیکھ چکا ہے، ایسے عظیم الشان خدا کو دیکھنے کے لیے اندھا بنا رہتا ہے۔

لیکن جو لوگ اس اندھے پن سے نکل جاتے اور خدا کی یاد کو زندگی بنا لیتے ہیں، وہ پہلے مرحلے پر خدا کو سنتا ہوا اور اگلے مرحلے پر سب کچھ کرتا ہوا دیکھنے لگتے ہیں۔وہ پکارتے ہیں اور خدا ان کی فریاد سن لیتا ہے۔ مانگی ہوئی چیز نہ ملے تو بہتر مل جاتی ہے اور اس سے بہتر ذخیرہ کر لی جاتی ہے۔جس کے بعد وہ خدا کو سب کچھ کرتا ہوا اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ان کا ایمان یقین میں بدل جاتا ہے۔

خدا ایک زندہ وجاوید حقیقت ہے۔اُس کی دریافت ایمانی سفر کی وہ درمیانی منزل ہے جو ہر اس شخص کو آخرکار نصیب ہوتی ہے جو تعصّبات اور خواہشات سے اوپر اٹھ جائے۔اس سفر کی آخری منزل جنت میں خدا کا قرب ہے۔مبارک ہیں وہ جو اس راستے کے مسافر ہیں۔

جنت کی محرومی

آپ کا جاننے والا کوئی شخص اگر کوئی تقریب منعقد کرے اور اس میں آپ کے تمام احباب اور رشتہ داروں کو بلائے، مگر آپ کو نہ بلائے تو یقیناً آپ اس میں اپنی توہین محسوس کریں گے۔ خاص کر جب کہ یہ دعوت نامہ آپ کے سامنے ہی دوسروں کو دیا جا رہا ہو۔

اس کا سبب یہ ہے کہ انسان کے لیے عزت نفس بہت بڑی چیز ہے۔ کھانا پینا اور کسی تقریب میں جانے سے زیادہ اہم بات یہ ہوتی ہے کہ اسے کمتر سمجھا گیا۔ اس لیے یہ بہت مشکل ہے کہ کوئی شخص اس طرح کی چیزوں سے اوپر اٹھ سکے۔ اس طرح کی چیزوں سے بلند ہونے کا حوصلہ صرف انھی انسانوں میں پیدا ہوتا ہے جن کا نصب العین جنت میں پروردگار عالم کا قرب تلاش کرنا ہوتا ہے۔

ان کو ہمہ وقت یہی فکر لاحق رہتی ہے کہ کل قیامت کے دن وہ ٹھکرا دیے گئے تو ان کا کیا ہوگا۔ جنت میں ان کے سارے جاننے والے چلے گئے اور وہ نہیں جاسکے تو کیا ہوگا۔ جنت میں انبیا علیھم السلام کی محفلوں میں ان کو نہیں بلایا گیا اور ان کے اردگرد کے لوگوں کو بلالیا گیا تو ان کی کیسی سبکی ہوگی۔ فردوس کے مالک نے اپنی خصوصی ملاقات میں ان کے احباب اور ہم عصر واقف کاروں کو بلالیا اور ان کو محروم رکھا تو وہ یہ محرومی کیسے برداشت کرسکیں گے۔

یہ لوگ اس ممکنہ محرومی کے احساس سے تڑپ اٹھتے ہیں۔ ان کی راتوں کی نینداس اندیشے سے اڑ جاتی ہے۔ وہ پوری قوت کے ساتھ اپنا احتساب شروع کرتے ہیں۔ وہ تعصب، خواہش، غفلت کی ہر اس غلاظت کو اپنے اندر سے کھرچ کر پھینکنے کی کوشش کرتے ہیں جو ان کے لباس ایمان اور لباس تقویٰ کو داغدار کرنے والی ہوتی ہے۔ کیونکہ یہی داغ انسان کو جنت کی اعلیٰ محفلوں سے محروم کردیں گے۔ وہ محرومی جو جنت میں جا کر بھی ختم نہیں ہوسکتی۔

کھونا اور پانا

انبیا علیہم السلام کی قومیں جب زوال پذیر ہوتی ہیں تو ایسا کم ہوتا ہے کہ وہ دین کا نام لینا چھوڑ دیں یا ان میں دینی جذبہ کم پڑ جائے۔ ہوتا اکثر یہ ہے کہ ان کی اصل وفاداری اللہ اور اس کے رسولوں سے ہٹ کر اپنے قومی اور فرقہ وارانہ تعصّبات کی طرف ہو جاتی ہے۔

یہود و نصاریٰ اس کی بہترین مثال ہیں۔ یہود قوم پرستی کی سب بڑی مثال ہیں۔ ان کو یہ ذمہ داری دی گئی تھی کہ وہ دنیا میں سچائی کے علمبردار بن کر کھڑے ہوں۔ خدا کے بندوں کو خدا تک پہنچائیں۔ مگر صدیوں کے زوال کے بعد ان کے قومی تعصّبات ان پر اتنے غالب آ گئے کہ وہ ایک داعی گروہ کے بجائے ایک قوم بن بیٹھے۔ یہودی قوم کا غلبہ، یہودیوں کا وطن، یہودیوں کی تہذیب ان کا سب سے بڑا مسئلہ بن گئی۔ یہاں تک کہ وہ اس قوم پرستی کے پیچھے اپنے پیغمبر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جان کے دشمن ہو گئے، مگر اپنی حرکتوں سے باز نہ آئے۔

نصاریٰ فرقہ وارانہ تعصّبات کی آخری انتہا تک جا پہنچے۔ وہ یہود کا ایک اصلاحی گروہ تھے جو حضرت عیسیٰ پر ایمان لے آئے تھے۔ مگر اس کے بعد وہ گروہ در گروہ بٹتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ وہ اس معاملے میں یہود سے بھی بہت آگے نکل گئے۔ اس وقت بھی دنیا بھر میں عیسائیوں کے 43 ہزار سے زیادہ فرقے پائے جاتے ہیں۔

بدقسمتی سے مسلمان بھی فرقہ پرستی اور قوم پرستی میں یہود و نصاریٰ سے پیچھے نہیں۔ مگر وہ نہیں جانتے کہ خدا کو پانے کے لیے اپنے آپ کو کھونا پڑتا ہے۔ آہ مگر آج کا مسلمان اپنی فرقہ وارانہ اور قوم پرستانہ سوچ کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں، اپنے آپ کو کیا چھوڑے گا۔ اور نہیں چھوڑ سکتا تو نہیں پا سکتا۔ خدا کو نہیں پا سکتا۔ سچائی کو نہیں پا سکتا۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام کی حقانیت کو نہیں پا سکتا۔ ہدایت کو نہیں پا سکتا اور آخر کار جنت کو نہیں پا سکتا۔ چاہے کتنا بڑا ہی اسلام کا دعویدار رہو۔ چاہے کتنا بڑا ہی خدا کا نام لیوا ہو۔

زمین کے وارث

اس دنیا میں کامیاب تاجر خوش اخلاق ہوتا ہے۔ اچھا باس اسی وقت تک اچھا رہتا ہے جب تک ملازم اپنے کام ذمہ داری کے ساتھ سرانجام دیں۔ والدین اولاد کی پرورش اپنی فطری ضرورت اور مستقبل کی امید کی بنا پر کرتے ہیں۔ اولاد کا والدین کے ساتھ اچھا رویہ اس تربیت کا نتیجہ ہوتا ہے جو والدین اور سماج کرتا ہے۔

یہ چند مثالیں ہیں جو بتاتی ہیں کہ اس دنیا میں انسان کی ہر خوبی کسی ضرورت یا مفاد کے تابع ہوتی ہے۔ بہت کم لوگ ہوتے ہیں جو اس سطح سے بلند ہوسکیں۔ جو ہوتے ہیں ان کی خوبیاں بھی کسی اور کی مہربانی اور احسان کا نتیجہ ہوتی ہیں۔

یہاں صرف ایک ہستی ہے جو اپنی ذات میں محمود ہے۔ اس کی کوئی خوبی کسی پر اس وجہ سے نہیں ہوتی کہ وہ کسی کا محتاج ہے۔ یا اس کی کوئی ضرورت کسی سے وابستہ ہے۔ وہ اتنا طاقتور ہے کہ اسے کسی کی مہربانی اور احسان کی ضرورت نہیں ہے۔

اللہ جب احسان کرتا ہے تو بدلے میں کوئی توقع نہیں رکھتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسے کوئی کچھ نہیں دے سکتا۔ حتیٰ کہ اس کا شکریہ ادا کرکے اور اس کی عبادت کرکے بھی اس کی مخلوق اسے کوئی نفع نہیں پہنچا سکتی۔ پھر سوال یہ ہے کہ اس نے انسان کو کیوں پیدا کیا ہے۔ وہ قرآن مجید میں وہ اخلاقی مطالبات کیوں کرتا ہے جن کا ایک خلاصہ ہم نے ''قرآن کا مطلوب انسان'' نامی کتاب میں جمع کردیا ہے۔

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے سے قریب تر لوگ ڈھونڈ رہے ہیں۔ اس دنیا کی تخلیق کا مقصد یہی ہے کہ ایسے لوگوں ڈھونڈے جائیں جو غیب میں رہتے ہوئے بلا زور وزبردستی بھی سچائی کو مان لیں۔ جو ان لوگوں پر احسان کریں جو ان کو جواب میں کچھ نہ دے سکتے ہوں۔

جو ان لوگوں کو معاف کر دیں جنھوں نے ان کے ساتھ زیادتی کی ہو۔

جو لوگ اپنے تعصّبات کے خلاف جا کر صرف دلیل کی بنیاد پر حقائق کو تسلیم کر لیں۔ جو خواہشات کے منہ زور گھوڑے کو صبر کی لگام سے قابو میں رکھیں۔ جو دوسروں کی جان، مال آبرو کا احترام کرنے کو اپنی اقدار بنالیں۔ جن کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے لوگ محفوظ رہیں۔

جو ان سے کٹیں وہ ان سے جڑیں۔ جو ان کو محروم کرے وہ ان کو دیں۔ جو ان پر ظلم کرے وہ ان پر احسان کریں۔ جن کی زبان لایعنی باتوں کے بجائے خیر، بھلائی اور حسن خلق کے پھول برساتی ہو۔ جن کی دماغی صلاحیت مخلوق کے بجائے خالق کی عظمت اور عنایات کے نت نئے پہلو ڈھونڈنے میں صرف ہوتی ہو۔ جن کے مال میں مانگنے والوں اور ضرورت مندوں کا حصہ ان کی اپنی ضروریات سے قبل ہی طے پا جاتا ہو۔ جن کی ترشی اور بدمزاجی سے ڈرنے کے بجائے لوگ ان کی محبت اور نرمی کے گرویدہ ہوں۔

یہ لوگ اپنی مرضی سے اپنی آزادی اور خواہشات پر بندگی کی لگام ڈال دیتے ہیں۔ یہ بیماری اور دکھ میں صبر سے کام لیتے ہیں۔ جو غربت اور فقر میں مایوسی کے بجائے دعا اور امید پر یقین رکھتے ہیں۔ جو حق و باطل کی جنگ میں غیر جانبدار رہنے کے بجائے سچائی کا ساتھ ہر قیمت پر دیتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ہر حال میں سچائی کی گواہی دیتے ہیں، چاہے وہ ان کے اپنوں کے خلاف ہو۔ یہ لوگ مخالفین کے معاملے میں بھی عدل سے کام لیتے ہیں، چاہے ان سے انھیں کتنا ہی اختلاف ہو۔ یہ لوگ مال، اولاد اور بیویوں کی محبت میں اندھے بن کر جینے کے بجائے شکر گزاری، احسان مندی اور بندگی کی زندگی گزارتے ہیں۔

یہی لوگ ہیں جن کی تلاش کے لیے یہ دنیا بنائی گئی ہے۔ یہی وہ خداشناس بندے ہیں جن کے لیے جنت بنائی گئی ہے۔ یہی اس زمین کے آخری اور ابدی وارث ہوں گے۔

اسلامی زندگی اور اسلامی نظام

قرآن مجید اپنے آغاز ہی میں سورہ بقرہ اور سورہ آل عمران کے شروع میں اپنا تعارف یہ کراتا ہے کہ وہ متقیوں اور انسانوں کے لیے ہدایت ہے۔ یہ بات مختلف اسالیب میں ان گنت مقامات پر دہرائی گئی ہے۔قرآن مجید اپنی اس ہدایت کا نتیجہ دنیا کی اصلاح اور آخرت کی فلاح کی شکل میں بیان کرتا ہے۔یعنی اس کی بات مان کر دنیا کے معاملات ٹھیک ہوجاتے ہیں اور انسانوں کو آخرت کی ابدی کامیابی نصیب ہوتی ہے۔

آخرت کا معاملہ تو قیامت کے دن ہی معلوم ہوگا لیکن دنیا کے بارے میں بڑی حد تک یہ بات واضح ہے کہ مسلمانوں اور اہل پاکستان کے اجتماعی معاملات کسی پہلو سے بھی ٹھیک نہیں ہیں۔جبکہ قرارداد مقاصد سے لے کر ختم نبوت کی آئینی ترمیم تک اور قصاص و دیت سے لے کر حدود تک، نماز صلوٰۃ سے لے کر نفاذِ زکوٰۃ تک دستوری سطح پر تبلیغی تحریکوں سے لے کر جہادی تحریکوں تک، داڑھی سے لے کر پردے تک، مسجدوں سے لے کر مدارس تک اسلام کا جو غلغلہ اس ملک میں ستر برسوں سے مچا ہوا ہے اس کا کوئی عشر عشیر بھی دنیا میں کہیں نہیں پایا جاتا۔

سوال یہ ہے کہ اسلام کے نام پر اس درجہ ہنگامہ آرائی اور جدوجہد کے باوجود کیوں ہمارے انفرادی اور اجتماعی معاملات خراب ہیں۔ایسا کیوں ہے کہ خدا کی نصرت کے بجائے ہم ہر جگہ ذلت و رسوائی، غربت و مہنگائی، بدامنی اور بداخلاقی کا دور دورہ دیکھ رہے ہیں۔

ہمارے نزدیک اس سوال کا جواب قرآن مجید کی روشنی میں بالکل واضح ہے۔قرآن مجید نے جس چیز کو ہدایت کہا اور جسے اسلامی زندگی کے عملی راستے کے طور پر ہمیں دکھایا، وہ ہماری مذہبی فکر میں بالکل غیر اہم ہو چکا ہے۔اس لیے کہیں زیر بحث بھی نہیں آتا۔قرآن مجید کے بتائے ہوئے اس راستے کو ہم نے قرآن کی آیات اور اسوہ حسنہ کی روشنی میں اپنی کتاب ''قرآن کا

مطلوب انسان''میں جمع کر دیا ہے۔اس کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان اللہ کی محبت اور بندگی کے جذبے سے سرشار ہو اور اپنے ہر تعصب اور عقیدت کو خدا کی مرضی کے سامنے ہیچ سمجھے۔انسان دوسرے انسانوں کے حوالے سے عائد ہونے والے فرائض اور ذمہ داریوں میں آخری درجہ میں حساس ہو اور لوگوں کے ساتھ احسان اور عدل کو زندگی بنالے۔یہ منکرات اور فواحش سے بچ کر ایک پاکیزہ زندگی گزارنے کا نام ہے۔اور سب سے بڑھ کر انسان ان چیزوں کا ہدف اپنی ذات اور اپنے اخلاقی وجود کو بنائے نہ کہ دوسروں پر ٹھونسنے اور نافذ کرنے کی دھن میں لگا رہے۔

اس کے برعکس ہماری مروجہ مذہبی فکر کا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ اس میں جو کچھ بھی دین ہے اس کا نشانہ ہمیشہ دوسروں کو بنایا جاتا۔ ہر بولنے اور لکھنے والے کی انگلی دوسروں کی طرف اٹھی رہتی ہے۔اس فکر میں اپنے تعصّبات اور اپنے گروہ سے ہٹ کر حق کہیں نہیں پایا جاتا نہ اپنے دائرے سے باہر کسی سچائی کا ساتھ دینا جائز ہے۔اس فکر میں اسلام حکومتی اور دستوری سطح کے کچھ اقدامات کا یا اپنے ظاہر میں داڑھی، پردہ، پائنچے کو درست رکھنے اور عمامہ پہننے کا نام ہے۔

ستر برس میں ہم نے اس مروجہ اسلام کا آخری ممکنہ عروج دیکھ لیا ہے۔ہمارا دستور جتنا اسلامی ہو چکا ہے، اس سے زیادہ نہیں ہوسکتا۔ جتنے مرد وخواتین داڑھی پردہ اختیار کر سکتے تھے کر چکے۔اب مغربی یلغار کے بعد ان کا تناسب معاشرے میں ہر حال میں کم ہوتا چلا جائے گا۔ جتنی لڑکیاں پردہ کریں گی اس سے دس گناہ زیادہ دوپٹہ اتاریں گی اور جتنے مرد باشرع داڑھی رکھیں گے اس سے دس گنا زیادہ لوگ داڑھیاں کٹوائیں گے۔

اب وقت آگیا ہے کہ ہم فیصلہ کریں کہ ہمیں قرآن مجید کی بتائی ہوئی اسلامی زندگی پر عمل کرنا ہے یا اسلامی نظام کے اس تصور پر جو دستور اور فرد کے ظاہر کی تبدیلی کو ہدف بناتا ہے۔ہمیں خدا خوفی کے اس تصور کو اختیار کرنا ہے جو عدل واحسان کے نبوی ماڈل پر قائم ہے یا اسلام پسندی کے

اس ماڈل پر قائم رہنا ہے جو احتجاج اور نعرہ بازی کو اسلام سمجھتا ہے۔ ہمیں فلاح آخرت کا متلاشی وہ انسان چاہیے جو اپنے احتساب اور اپنی بہتری کی کوشش میں مشغول رہتا ہے یا پھر وہ جو دوسروں پر اسلام ٹھونسنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ ہمیں انسانیت کے وہ ہمدرد چاہئیں جو پوری خیر خواہی سے ان کی اصلاح اور ہدایت کے خواہشمند ہوں یا وہ خدائی فوجدار چاہئیں جو انسانیت کو اپنوں اور غیروں کے خانے میں تقسیم کیے رکھیں۔ ہمیں وہ حکیم داعی چاہئیں جو گہری بصیرت کے ساتھ لوگوں کو دعوت دین دیں یا پھر وہ خدائی فوجدار چاہئیں جو اندھے راہ دکھانے والوں کا کردار ادا کرتے ہیں۔ ہمیں فرقہ پرست دیندار چاہئیں یا پھر خدا پرست بندے چاہئیں جو رب کی مرضی کو اپنے تعصب اور خواہش پر غالب رکھیں۔

ہم نے ستر برس ایک تجربہ کر کے دیکھ لیا۔ اب وقت آ گیا ہے کہ ہم مزید تباہی سے پہلے قرآن مجید کے اصل پیغام کی طرف لپکیں۔ اگر ہم نے اس پیغام کو اختیار کر لیا تو پھر دنیا اور آخرت کی کامیابی ہمارا مقدر ہے۔ ورنہ اپنی تباہی سے ہم زیادہ دور نہیں رہ گئے۔

اسلام، اسلام ازم اور مغرب

[یہ ابو یحییٰ صاحب کی اس تقریر کا متن ہے جس کا انگریزی ترجمہ یونیورسٹی آف ویسٹرن آسٹریلیا، پرتھ میں منعقد ہونے والی ایک کانفرنس میں پڑھا گیا، ادارہ]

انسان اس دھرتی پر کتنے عرصے سے آباد ہے، یہ بات کچھ قطعیت کے ساتھ تو نہیں بتائی جاسکتی، لیکن معلوم انسانی تاریخ کا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ اس کرہ ارض پر انسانوں کی تاریخ باہمی تصادم اور خونریزی سے عبارت ہے۔ پوری انسانی تاریخ کا احاطہ کرنا تو اس مختصر گفتگو میں ممکن نہیں لیکن ہم جانتے ہیں کہ ہابیل و قابیل سے شروع ہونے والے تنازعات نے پہلے قبائلی جھگڑوں اور پھر بادشاہوں اور خاندانوں کی حکومت کی شکل میں قوموں کے درمیان مستقل جنگ وجدل کی شکل اختیار کرلی۔ اگر ہم جدید تاریخ کی بات کرلیں تو چھوٹے بڑے تنازعات کی ایک طویل فہرست ہمارے سامنے آتی ہے۔

دورِ جدید کی تاریخ کے دو مراحل گزر چکے ہیں۔ دورِ جدید کی تاریخ کا پہلا مرحلہ وہ تھا جب اقوامِ عالم قومی ریاستوں کی بنیاد پر تقسیم تھیں۔ اس دور میں مغرب کی اقوام علم وفن اور ٹیکنالوجی سے مسلح ہوکر اپنے ممالک سے نکلیں اور پوری دنیا پر اپنا اقتدار قائم کرلیا۔ بعد میں جنگ عظیم اول اور دوم کے نتیجے میں سامراجی ممالک کی قوت ختم ہوگئی۔ نوآبادیاتی ریاستیں ایک ایک کرکے آزاد ہوگئیں۔ تاہم اس کے بعد اقوام عالم ایک نئی کشمکش کا شکار ہوگئیں۔ یہ کشمکش نظریاتی بنیادوں پر تھی جس میں جدید دنیا کے اہم اور طاقتور ترین ممالک، کمیونزم اور سرمایہ دارانہ نظام کی بنیاد پر، امریکہ اور سوویت یونین کے زیر سایہ، دو حصوں میں تقسیم ہوگئے۔ یوں بیسویں صدی کا نصفِ آخر دو عظیم سپر پاورز کی باہمی چپقلش سے عبارت رہا۔ یہ وہ دور تھا جب بظاہر غیر جانبدار کہلائے جانے والے ممالک بھی کسی نہ کسی اعتبار سے دو سپر پاورز سے متعلق تھے۔ ان ممالک کی یہ کشمکش صرف نظریاتی بنیادوں تک محدود نہ تھی بلکہ اس عرصے میں دنیا ایٹمی جنگ کی شکل میں اپنی مکمل فنا

کے خطرے سے دوچار رہی۔ اس کے علاوہ سپر پاورز کی پراکسی وار اور دیگر ممالک کی باہمی جنگ وجدل میں انسانی خون مسلسل بہتا رہا۔ دورِ جدید کی تاریخ کا یہ دور سوویت یونین کے خاتمے کے ساتھ تمام ہوا۔

کمیونزم کے زوال کے نتیجے میں سوویت یونین ختم ہوا تھا، دنیا نہیں۔ چنانچہ سرد جنگ کے فاتح اہل مغرب کے ذہنوں میں یہ سوال پیدا ہونا شروع ہوا کہ اب دنیا کے معاملات کس اصول پر چلیں گے؟ اقوام عالم کی نئی صف بندی کن اساسات پر ہوگی؟ نیا عالمی نظام کن بنیادوں پر استوار ہوگا؟ ان سوالات کے نتیجے میں بہت سے جوابات سامنے آئے مگر جس نقطۂ نظر نے دنیا بھر کے اہل علم و دانش کی توجہ حاصل کی وہ سیموئل پی ہنٹنگٹن کے شہرۂ آفاق مضمون ''تہذیبوں کا تصادم'' میں پیش کیا گیا۔ یہ مضمون 1993 میں 'فارن افیئرز' نامی جریدے میں شایع ہوا۔ بعد میں مصنف نے اسی عنوان سے ایک کتاب میں اپنے نقطۂ نظر کو تفصیلی دلائل کے ساتھ موید کر کے پیش کیا۔

اس کتاب کی اشاعت پر قریباً ربع صدی کا عرصہ گزر چکا ہے اور اس دوران میں پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی بہہ چکا ہے۔ بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ بین اقوامی سیاست میں اس وقت جو کچھ ہو رہا ہے اس کی سب سے بہتر تفہیم بلاشبہ اسی خاکے کی بنیاد پر کی جاسکتی ہے جو ''تہذیبوں کا تصادم'' میں پیش کیا گیا تھا۔ یہ کتاب اپنے صفحات کے اعتبار سے تو بے حد ضخیم ہے مگر مرکزی خیال کے اعتبار سے بہت مختصر۔ یعنی سرد جنگ کے بعد کی دنیا ثقافتی بنیادوں پر تقسیم ہوگی اور یہی تقسیم مستقبل کی جنگ و امن کے سلسلے میں فیصلہ کن ہوگی۔

یہ کتاب ایک خاص نقطۂ نظر کی تنقید میں لکھی گئی تھی جو سرد جنگ کے خاتمے اور کمیونزم کے خلاف مغرب کی کامیابی کے بعد مغربی حلقوں میں بڑا مقبول ہوا تھا۔ یعنی آزاد، جمہوری اور سرمایادارنہ مغربی معاشرہ انسانی فکری ارتقا کی آخری حد ہے۔ جس کے بعد دنیا پر واضح ہو چکا ہے کہ یہی اقدار مبنی برحق ہیں۔ دنیا انہیں قبول کر رہی ہے۔ اسے ایسا ہی کرنا چاہیے۔ اس عمل کے نتیجے میں ایک

عالمی آفاقی تہذیب وجود میں آجائے گی جس کا امام مغرب ہوگا۔ اس نقطۂ نظر کی نمائندہ کتاب 1989ء میں شایع ہونے والی فرانسس فوکویاما کی کتاب "The End of History" تھی۔

مصنف نے اس نقطۂ نظر کو رد کرتے ہوئے اہل مغرب پر یہ بات واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ سرد جنگ کے بعد بین الاقوامی تصادم ختم نہیں ہوا بلکہ اس کی اساسات بدل گئی ہیں۔ پہلے یہ تصادم قومی اور نظریاتی بنیادوں پر ہوتا تھا اور اب تہذیبی بنیادوں پر ہوگا۔ مصنف واضح طور پر یہ بتاتے ہیں کہ مغرب کا ٹکراؤ ممکنہ طور پر چین اور مسلم دنیا سے ہوگا۔

آج ہم دورِ جدید کے تیسرے دور میں سانس لے رہے ہیں۔ بہت سے حلقے ہنٹنگٹن کی اس رائے سے نہ اس وقت متفق تھے اور نہ آج ہیں۔ مگر دنیا کو دیکھنے کا ایک تناظر یہ ہے کہ کیا ہونا چاہیے اور دوسرا یہ کہ درحقیقت کیا ہو رہا ہے۔ پہلے زاویے سے دیکھا جائے تو ہم میں سے کوئی بھی ہنٹنگٹن سے اتفاق نہیں کرنا چاہے گا۔ دوسرے زاویے سے جب ہم پوسٹ نائن الیون دنیا کا جائزہ لیتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ اس سے اختلاف کرنا آسان نہیں ہے۔ القاعدہ کا 23 فروری 1998 کا افغانستان سے جاری کیا ہوا وہ فتویٰ ہو جس میں امریکہ اور اس کے اتحادیوں کے خلاف اعلان جہاد کرتے ہوئے فوجی اور سویلین کا قتل جائز قرار دیا گیا یا پھر نائن الیون کا واقعہ ہو، امریکہ کا افغانستان اور پھر عراق پر حملہ ہو یا دہشت گردی کے خلاف عالمی جنگ کا معاملہ ہو، یا القاعدہ، طالبان اور اب داعش کی مغربی طاقتوں سے مسلسل جنگ ہو، سب اس بات پر شاہد ہیں کہ مسلم تہذیب اور مغربی تہذیب کلی نہ سہی مگر جزوی طور پر حالت جنگ میں ہیں۔ اس جزوی جنگ کے نتیجے میں لوگوں میں دوریاں پیدا ہونا شروع ہوگئی ہیں۔ ایک طرف مسلم ممالک کے عوام میں مغربی ممالک کے خلاف نفرت بڑھ رہی ہے اور دوسری طرف بعض مغربی ممالک میں برقعے اور اسکارف پر پابندی، اسلامو فوبیا کے فروغ، مسلمان مخالف سیاستدانوں کی مقبولیت اور مسلم ممالک کے لوگوں کو معقول وجوہات کے باوجود مغربی ممالک

کے ویزہ نہ ملنے کا عمل اس بات کا اظہار ہے کہ دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی۔

یہ صورتحال بتاتی ہے کہ یہ جزوی تصادم اسلام اور مغرب کے مکمل تصادم میں بدل سکتا ہے، اگر ہم نے صورتحال کو بہتر بنانے میں اپنا کردار ادا نہیں کیا۔ یہ طالب علم ایک مسلمان اور اسلام کے ایک نمائندے کی حیثیت سے یہ چاہتا ہے کہ وہ اسلام کا نقطہ نظر سامنے رکھے۔ اور یہ واضح کرنے کی کوشش کرے کہ اسلام کی اصل تعلیم عالمی تصادم کو ختم کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ یہ فرد، معاشرے اور تمام انسانیت کے لیے خیر وفلاح کا پیغام ہے۔

اس طالب علم کے نزدیک یہ اسلام اور مغرب کی جنگ نہیں بلکہ اسلام کے نام پر بیسویں صدی میں متعارف کرائی جانے والی دین کی ایک سیاسی تعبیر یعنی سیاسی اسلام یعنی اسلام ازم اور مغرب کے بعض سیاسی گروہوں کی جنگ ہے جن کے مفادات جنگ اور تصادم سے وابستہ ہیں۔ اسلام ازم کی فکر کو بیسویں صدی کے ربع اول میں قبل از تقسیم ہندوستان میں مولانا مودودی اور مصر میں حسن البنا نے متعارف کرایا تھا۔ بعد میں مصر کے سید قطب نے اس فکر کو اپنے قلم سے مزید طاقت بخشی تھی۔

اس فکر کا بنیادی خیال یہ تھا کہ اسلام کل دنیا میں اپنا غلبہ قائم کرنے کے لیے آیا ہے۔ اس لیے مسلمانوں کی یہ ذمہ داری ہے کہ پہلے اپنے معاشروں میں اور پھر پوری دنیا میں اسلام کو سیاسی طور پر غالب کر دیں۔ اس فکر کے پیش کرنے والوں کے نزدیک مسلم ممالک میں جو اشرافیہ حکمران ہے وہ سیکولر ازم کی علمبردار، مغربی تہذیب سے متاثر اور انھی کے مفادات کی نگہبان ہے۔ چنانچہ ان کو اقتدار سے ہٹا کر اقتدار پر قبضہ کرنا کرنے کا بنیادی کام ہے۔ ابتدا ہی میں اس فکر کے حاملین کا ٹکراؤ اپنے ملک کی قیادت سے ہو گیا۔ خاص کر مصر اور دنیائے عرب اس تصادم کا بڑا میدان تھی۔ پاکستان میں خوش قسمتی سے مولانا مودودی نے جمہوری راستہ اختیار کر لیا تھا اس لیے وہاں یہ ٹکراؤ فکری اور سیاسی میدان تک ہی رہا۔ پاکستان میں اسلام کو ریاستی سطح پر نافذ

کرنے کے لیے دستوری جدوجہد کے ذریعے بہت سی تبدیلیاں اور ترامیم کی گئیں۔ یوں پاکستان میں دہشت گردی کی موجودہ لہر سے قبل یہ ایک دستوری جدوجہد ہی رہی۔

1979 میں جس وقت سوویت یونین نے افغانستان پر قبضہ کیا تو امریکہ کی سربراہی میں مغربی ممالک اور اسلامی ممالک کے اتحاد نے اپنی پراکسی جنگ لڑنے کے لیے اسلامسٹ فکر کو نہ صرف فروغ دیا بلکہ عملی طور پر انھیں ہر ممکن سہولت، جنگی تربیت، اسلحہ اور مالی معاونت فراہم کی۔ مغرب کی سیاسی قیادت نجانے اس بات سے کیوں انجان بن گئی کہ وہ افغانستان کرائے کے سپاہی نہیں بھیج رہے بلکہ اسلام ازم کی فکر کو ایک نرسری فراہم کر رہے ہیں جس کا آخری ہدف پوری دنیا پر اسلام کا سیاسی غلبہ قائم کرنا ہے۔ جن کے نزدیک مغربی سیکولر نظام ہو یا مسلم آمرانہ اور جمہوری حکومتیں سب ہی حکومت سے معزول کیے جانے کے قابل ہیں۔ چنانچہ یہ کچھ افراد کو طاقت دینے کا عمل نہیں تھا بلکہ ایک عالمی سیاسی غلبہ کی دعویدار فکر کو طاقتور بنانے کے ہم معنی تھا۔ افغانستان کی فکر ختم ہوگئی مگر یہ نظریہ زندہ تھا۔ چنانچہ یہی وہ نظریہ ہے جو ایک کے بعد دوسری تنظیم اور ایک کے بعد دوسرے لیڈر کی شکل میں آج بھی ظاہر ہو رہا ہے۔

اسلام ازم کی اس فکر پر عالم اسلام میں بہت طاقتور علمی اور فکری تنقیدیں ہو چکی ہیں۔ مگر زمینی حالات کی بنا پر ان تنقیدوں کو اپنی تمام تر صحت کے باوجود مسلمانوں کی فکری قیادت میں زیادہ قبولیت نہیں ملی۔ اس کا سبب پچھلی دو صدیوں میں مسلم ممالک پر مغربی ممالک کی تاریخ ہے۔ جبکہ اس صورتحال کو پیچیدہ بنانے میں کشمیر اور فلسطین کے سیاسی تنازعات نے اہم کردار ادا کیا ہے جو عام مسلمانوں میں اینٹی مغرب خیالات کے فروغ کا اہم سبب ہیں۔ ایسے میں اہل مغرب کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ دنیا کے لیڈر ہونے کی ذمہ داری کو قبول کرتے ہوئے جلد از جلد سیاسی تنازعات کے خاتمے کے لیے کوشش کریں۔ جبکہ دوسری طرف ضروری ہے کہ اب عام لوگوں تک اسلام کا اصل پیغام قرآن مجید اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کی روشنی میں

پہنچایا جائے تاکہ اسلام کا امن اور محبت پر مبنی روشن چہرہ لوگوں کے سامنے نمایاں ہو۔

قرآن مجید کے مطابق اللہ تعالیٰ نے یہ دنیا انسانوں کے امتحان کے لیے بنائی ہے۔ امتحان یہ ہے کہ کون غیب میں رہتے ہوئے اللہ پروردگار پر ایمان لاتا ہے اور اس کے احکام پر اپنی آزادانہ مرضی سے عمل کرتا ہے۔ یہاں ہر شخص کو اختیار ہے کہ ایمان لائے یا انکار کر دے۔ قرآن مزید وضاحت کرتا ہے کہ دین میں کوئی جبر نہیں۔ اس پہلو سے دیکھیں تو اسلام ایک دعوت ہے۔ یہ کوئی جبر نہیں ہے۔ یہ اپنی مرضی سے خدا کے حکم کے سامنے جھک جانے کا نام ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کو بن دیکھے اس کے سامنے جھک جانے کا نام ہے۔ یہ اختیار رکھتے ہوئے بے اختیار ہو جانے کا نام ہے۔ اسلام دوسروں پر دین ٹھونسنے کا نام نہیں۔ یہ دوسروں کی خیر خواہی کے جذبے سے ان تک ان کے رب کا پیغام پہنچانے کا نام ہے۔ جو لوگ ایمان لائیں قرآن مجید ان کے سامنے اپنے نفس کے تزکیہ کا ہدف رکھتا ہے۔ اس کے ساتھ ان کو یہ بشارت دیتا ہے کہ جس شخص نے تزکیہ نفس کا راستہ اختیار کیا وہ جنت کی ابدی کامیابی کے حقدار ہیں اور جو نفس کو آلودہ کریں گے ان کے لیے آخرت کی نامرادی ہوگی۔

اس تزکیہ نفس کا جو راستہ دین بیان کرتا ہے وہ ایمان و عمل صالح کے کچھ مطالبات ہیں جو قرآن میں بیان ہوئے ہیں۔ ان مطالبات کا بنیادی خلاصہ یہ ہے کہ انسان اپنے خالق کے ساتھ اور مخلوق خدا کے ساتھ اپنا تعلق درست بنیادوں پر استوار کر لے۔ یہ درست بنیادیں عدل، احسان اور انفاق ہیں۔ قرآن مجید ان تین چیزوں کو اختیار کرنے کا حکم دیتا ہے اور تین چیزوں یعنی بدکاری، حق تلفی اور ظلم سے رکنے کا حکم دیتا ہے۔ چنانچہ اسلام کی تعلیمات ایک طرف فرد کو آنے والی دنیا میں کامیابی کی بشارت دیتی ہیں اور دوسری طرف دنیا میں انسانیت کے لیے فلاح و بہبود کا سامان ہیں۔ اس لیے کہ دنیا میں ہمیشہ فساد کی وجہ یہی رہی ہے کہ لوگ عدل، احسان، دوسروں کی مدد سے گریزاں رہتے ہیں اور بدکاری، ظلم اور حق تلفی کا راستہ اختیار کرتے ہیں۔

اسلام نے اپنے پیروکاروں کے سامنے جو مطالبات رکھے ہیں ان میں سے بیشتر کا تعلق افراد کی ذاتی زندگی سے ہے۔ یہ مطالبات انسان کے جسم کی پاکیزگی اور خورونوش کی پاکیزگی کے حوالے سے ہیں۔ یہ احکام خدا کی عبادت اوراس کے بارے میں درست نقطہ نظر رکھنے کے حوالے سے ہیں۔ یہ احکام مخلوق خدا کے ساتھ عدل واحسان کے تقاضے پورا کرنے کے حوالے سے ہیں۔ یہ احکام بدکاری سے رکنے اور عفت کے فروغ کے حوالے سے ہیں۔

تاہم انسان چونکہ ایک سماجی وجود ہے اس لیے قرآن مجید نے انسان کی معاشرتی حیثیت کو ملحوظ رکھ کر بھی کچھ احکام دیے ہیں۔ چنانچہ ایک فرد جب شوہر بنتا ہے تو اس حیثیت میں کچھ ذمہ داریاں اس پر عائد ہو جاتی ہیں۔ والدین اور اولاد کے تعلق کی شکل میں کچھ اور ذمہ داریاں اس پر عائد ہوتی ہیں۔ قرابت داروں سے معاملہ کرتے ہوئے کچھ ذمہ داریاں اس پر عاید ہوتی ہیں۔

معاشرے کی سیاسی تنظیم ریاست ہے۔ چنانچہ کوئی شخص اس ریاستی ڈھانچے کا حکمران بنتا ہے تو دین اس پر بھی کچھ ذمہ داریاں عاید کر دیتا ہے۔ مثال کے طور پر ضرورت کے موقع پر جنگ و جہاد کا فیصلہ کرنا۔ جرائم کی سرکوبی کے لیے کچھ خاص جرائم کے حوالے سے دی گئی سزاؤں کو نافذ کرنا۔ جمعہ کا اہتمام کرنا۔ نیکی کے فروغ اور برائیوں کے پھیلاؤ کو روکنے میں اپنا کردار ادا کرنا، زکوٰۃ کی وصولیابی وغیرہ۔

اسی طرح معاشرے میں خیر وشر کا شعور قائم رکھنے کے لیے اور دین کی دعوت کو زندہ رکھنے کے لیے یہ حکم دیا گیا ہے کہ معروف یعنی مسلمہ طور پر مانی ہوئی اچھائیوں جیسے انصاف، دیانت، رحم وغیرہ کی تلقین کی جائے اور منکر یعنی مسلمہ طور پر بری مانی ہوئی برائیوں جیسے ظلم، رشوت، دھوکہ دہی سے لوگوں کو روکا جائے۔ علما کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ معاشرے کے تمام طبقات کو انذار کریں۔ یعنی خدا کے حضور پیشی کا احساس زندہ رکھیں اور لوگوں کو اللہ کے احکام پر عمل کرنے کی تلقین کریں تاکہ وہ اللہ کی پکڑ کی زد میں نہ آئیں۔ حکمران بھی اگر اپنی ذمہ داریاں پوری نہ کریں

تو ان کو بھی وعظ و نصیحت ہی کیا جا سکتا ہے۔ یہی علماء کے کرنے کا کام ہے۔

دین کی ان تعلیمات کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے اللہ تعالیٰ نے انسان کی آزادی کو کسی پہلو سے ختم نہیں کیا۔ جس طرح ایمان لانے یا نہ لانے کی آزادی ہے اسی طرح دینی احکام پر عمل کرنے نہ کرنے کی بھی پوری آزادی ہے۔ اسلام منافقین پیدا نہیں کرنا چاہتا جو ظاہر میں نیک ہوتے ہیں اور اندر سے منکر ہوتے ہیں۔ چنانچہ آزادی کی اس قدر کو تمام دینی احکام میں بھی پوری طرح برقرار رکھا گیا ہے۔ فرد کو جو احکام ذاتی حیثیت میں دیے گئے ہیں، وہ آزاد ہے کہ ان پر عمل کرے یا نہ کرے۔ البتہ قرآن یہ ضرور بتاتا ہے کہ بن دیکھے خدا کی اطاعت کا بدلہ ابدی جنت اور خدا کو نظر انداز کرنے کا نتیجہ جہنم کا قید خانہ ہے۔ انسان کی ابدی کامیابی اور نجات خدا کی مرضی کی زندگی گزارنے پر منحصر ہے لیکن یہ مکمل طور پر انسانوں کا اختیار ہے کہ وہ اس دنیا میں چاہیں تو بندگی کا راستہ اختیار کریں چاہیں تو نہ کریں۔ وہ چاہیں تو عدل، احسان، انفاق کی مثبت اقدار کو اختیار کرنے اور بدکاری، ظلم اور حق تلفی جیسی منفی صفات سے روکنے والی فطری تعلیمات کو اختیار کریں اور چاہیں تو نہ کریں۔ مگر اس پورے معاملے میں جبر نہیں ہے۔ زبردستی نہیں ہے۔

تاہم غلط کو غلط کہا جائے گا، اس سے باز آنے کی تلقین کی جائے گی۔ صحیح کو صحیح کہا جائے گا، اسے اختیار کرنے کی تلقین کی جائے گی۔ نصیحت کی جائے گی۔ یاد دہانی کرائی جائے گی۔ برائی کا برا ہونا اور اچھائی کا اچھا ہونا واضح کیا جائے گا لیکن لوگوں کے اختیار پر پہرے نہیں بٹھائے جائیں گے۔ ہاں جن لوگوں کو اجتماعی ذمہ داریاں دی گئی ہیں، چاہے معاشرے کی سطح پر ہوں یا ریاستی سطح پر، ان کی ذمہ داری ہے کہ وہ ان احکام کی پیروی کریں جن کا ان کو حکم دیا گیا ہے۔ چنانچہ حکمران معاشرے میں نیکی کے فروغ کے لیے اقدامات کریں گے۔ وہ حق تلفی اور ظلم روکنے کے لیے قانون سازی کریں گے۔ قتل اور چوری کی سزا دیں گے۔ فساد فی الارض اور زنا کی سزا پر عملدرامد کریں گے۔ لیکن حکمرانوں کا یہ حق نہیں کہ وہ مثال کے طور پر لوگوں کو روزہ رکھوائیں اور

نہ رکھنے پر سزا دیں۔ خواتین کو ڈرائیونگ کرنے سے روکیں، مردوں کو ڈاڑھیاں رکھوائیں یا خواتین کو پردہ کرائیں۔ یہ فرد کا ذاتی دائرہ ہے۔ اس میں اسے مکمل آزادی حاصل ہے۔ یہ اس کا اور اس کے رب کا معاملہ ہے۔ ایک مسلمان کا یہ حق ہے کہ کوئی حکم سمجھ میں نہیں آتا وہ علما کے پاس جا کر دین سمجھے گا۔ جس عالم کی بات قرآن وسنت سے قریب محسوس ہوئی اسی پر عمل کرے گا۔ لیکن اس پر کوئی چیز زبردستی نہیں ٹھونسی جاسکتی۔

اسی طرح یہ بات بھی یاد رہے کہ غیر مسلموں کے ساتھ اہل اسلام کا تعلق نفرت یا تصادم کا نہیں بلکہ ان کا باہمی رشتہ داعی اور مدعو کا ہے۔ ختم نبوت کے بعد مسلمان اپنے دین پر عمل کر کے اور اپنے دین کی تعلیمات کو دوسرے تک پہنچا کر لوگوں کو اسلام کا پیغام پہنچائیں گے۔ لوگوں پر سیاسی طور پر غالب آنا، ان کے ہاتھ سے اقتدار چھین کر ان کے ملکوں پر قبضہ کرنا یہ مسلمانوں کا کام نہیں ہے۔

اس معاملے میں جو غلط فہمی ہوئی ہے وہ رسولوں اور ان کے اولین مخاطبین کے حوالے سے قرآن مجید میں بیان کیے گئے خاص احکام ہیں۔ قرآن مجید کے مطابق اللہ تعالیٰ جس قوم میں کوئی رسول بھیج دے اس کا فیصلہ دنیا میں ہو جاتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے

''ہر قوم کے لیے ایک رسول ہوتا ہے اور جب ان کا رسول آجاتا ہے تو ان کے درمیان عدل سے فیصلہ کر دیا جاتا ہے اور ان پر ظلم نہیں کیا جاتا۔'' یونس 47

چنانچہ اسی اصول پر قوم نوح، عاد، ثمود، آل فرعون، قوم لوط اور قوم شعیب وغیرہ کو تباہ کر دیا گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چونکہ کافی صحابہ مل گئے تھے، اس لیے ان کے معاملے میں یہ فیصلہ ہوا کہ انسانوں کی تلوار سے عذاب آئے گا۔ چنانچہ ارشاد ہوا۔

''ان سے لڑو اللہ تمھارے ہاتھوں سے ان کو عذاب دے گا۔'' توبہ 14

چنانچہ قریش کی لیڈرشپ کو اسی اصول پر بدر میں قتل کیا گیا۔ تاہم باقی عرب ایمان لے آیا۔ اور چونکہ اللہ کا یہ وعدہ تھا کہ ایمان لانے والوں کو زمین کا اقتدار دے گا تو صحابہ کرام کے لیے

ایسے حالات پیدا کیے گئے کہ عرب کے بعد روم وایران بھی مفتوح ہو گئے۔ یہ خدائی وعدہ کا ظہور تھا جو سورہ نور میں اس طرح کیا گیا تھا۔

''تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے عملِ صالح کیے ان سے اللہ کا وعدہ ہے کہ ان کو ملک میں اقتدار بخشے گا جیسا کہ ان لوگوں کو اقتدار بخشا جو ان سے پہلے گزرے اور ان کے اس دین کو متمکن کرے گا جس کو ان کے لیے پسندیدہ ٹھہرایا اور ان کی اس خوف کی حالت کے بعد اس کو امن سے بدل دے گا۔ وہ میری ہی عبادت کریں گے اور کسی چیز کو میرا شریک نہیں ٹھہرائیں گے۔ اور جو اس کے بعد کفر کریں گے تو درحقیقت وہی لوگ نافرمان ہیں۔''

(سورۃ نور آیت ۵۵)

جس کے بعد ہم یہ دیکھتے ہیں کہ خلفائے راشدین نے دنیا پر اس طرح حکومت کی کہ گویا آسمانی بادشاہی دنیا میں قائم ہو گئی۔ اس آسمانی بادشاہی میں خلیفہ وقت سب کا خادم ہوتا تھا اور تمام شہری برابر کی حیثیت کے مالک تھے۔ عدل وانصاف عام تھا۔ مالی فراوانی تھی۔ امن وامان میسر تھا۔ یہ اسلامی تعلیمات پر عمل کرنے کی وہ برکتیں تھیں جو اس زمین پر ہی ظاہر ہوئیں۔

قرآن مجید کے مطابق رسولوں کی اقوام کو دنیا میں دی جانے والی یہ سزا اور جزا دراصل قیامت کے آنے کا ایک زندہ ثبوت ہیں۔ اس بات کا ثبوت ہیں کہ اس دنیا کو بنانے والا خدا اس سے لاتعلق ہو کر نہیں بیٹھا۔ بلکہ وقفے وقفے سے وہ اِسی دنیا میں اپنے رسولوں کو بھیج کر سزا و جزا دیتا رہتا ہے تاکہ لوگ آخرت کی سزا و جزا کا انکار نہ کر بیٹھیں۔ آخری دفعہ یہ سزا و جزا عرب کی سرزمین میں برپا کی گئی اور اس کی روداد قرآن مجید اور تاریخ کے ریکارڈ میں محفوظ کر دی گئی کہ کس طرح تن تنہا ایک شخص نے ایمان کی صدا دی اور اللہ کا یہ فیصلہ سنا دیا کہ نہ ماننے والے آخر کار ہلاک کر دیے جائیں گے۔ دوسری طرف یہ اعلان کر دیا گیا کہ ماننے والوں کو زمین کا اقتدار دے دیا جائے گا۔ صرف ربع صدی میں یہ دونوں باتیں پوری طرح ظاہر ہو گئیں۔ عرب کی پوری

لیڈرشپ ہلاک کر دی گئی اور ماننے والے غریب اور بے کس لوگ اس زمانے کی سب سے بڑی سپر پاور بنا دیے گئے۔ اس سے یہ بات آخری درجہ میں ثابت ہوگئی کہ جس خدا نے یہ معجزہ کر دیا وہ قیامت بھی ضرور برپا کرے گا۔ اب مسلمانوں کی ذمہ داری صرف یہ ہے کہ وہ خود بھی دین پر عمل کریں اور ساتھ میں دین حق کی شہادت انسانیت کو دیتے رہیں اور ان تک پیغام حق پہنچاتے رہیں۔ تاکہ قیامت کے دن اللہ کے بندے اور بندیاں یہ نہ کہہ سکیں پروردگار ہمیں آپ کے منصوبے کا علم نہیں ہوسکا۔ یہی مسلمانوں کے کرنے کا اصل کام ہے۔ یہی وہ کام تھا جو صحابہ کرام نے سرانجام دیا۔،

''اور اسی طرح ہم نے تم کو ایک درمیانی امت بنایا ہے تا کہ تم لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہو۔'' البقرہ۔143

خلاصہ اس گفتگو کا یہ ہے اسلام انسانیت کے لیے فلاح کا پیغام لایا ہے۔ یہ فلاح آخرت کی ابدی زندگی کی بھی اور دنیا کی بھی ہے۔ اسلام کسی پر زور زبردستی نہیں کرنا چاہتا۔ اللہ تعالیٰ چاہتے تو کسی کے لیے ممکن نہ تھا کہ وہ اس کی نافرمانی کر سکے۔ اللہ نے جس طرح پوری کائنات کو اپنے حکم کا پابند کر رکھا ہے اسی طرح وہ انسان کو بھی بنا سکتے تھے۔ مگر وہ انسانوں کا امتحان لے رہے ہیں کہ کون بن دیکھے اچھے عمل کرتا ہے۔ اسلام اول تا آخرت دعوت ہے۔ یہ کوئی جبر نہیں۔ یہ دعوت انسان کو آزاد مان کر دی جا رہی ہے۔ اور دعوت ہی اس بات کی ہے کہ ایک محدود دائرے میں اپنی آزادی کو چھوڑ کر خدا کی بندگی اختیار کر لو۔ اس کا بدلہ ختم نہ ہونے والی جنت ہے۔ یہی معاملہ اسلامی احکام کا ہے۔ چاہے ان کا تعلق فرد سے ہو یا اجتماع سے۔ اسلام کا راستہ انذار اور تبشیر ہے۔ نیکی کی تلقین اور برائی سے منع کرنا ہے۔ اسلام جبر نہیں، نفرت نہیں۔ اسلام محبت ہے۔ اسلام دعوت ہے۔ یہی اسلام کا خلاصہ ہے۔ یہی امن کی راہ ہے۔

آپ کا بہت بہت شکریہ۔

پروفیسر ڈاکٹر محمد عقیل

کیا آپ نے سورۃ فاتحہ پڑھی ہے؟

کیا تم نے سورہ فاتحہ پڑھی ہے؟ ایک بزرگ نے اس سے پوچھا۔

ہاں ہاں! کیوں نہیں! ہر روز نماز میں پڑھتا ہوں؟ اس نے تعجب سے جواب دیا۔

اچھا ذرا پہلی آیت پڑھ کر سناؤ۔ بزرگ نے کہا۔

الحمد لله رب العالمين

یعنی تمام تعریف اللہ رب العالمین ہی کے لیے ہے۔ اس نے جواب دیا۔

اچھا تم فیس بک پر تصاویر لائیک کرتے ہو، کیا تم نے کبھی خدا کی مصوری کو بھی لائیک کیا؟ تم فلمی ستاروں کی تعریف کرتے ہو، کبھی خدا کے ستاروں کی تعریف کی؟ تم کاغذ کے پھولوں سے جی بہلاتے ہو، کبھی خدا کے گلزاروں کو چاہنے کی کوشش کی؟ نہیں یہ تو میں نے کبھی نہیں کیا؟

تو پھر تم نے یہ آیت پڑھی ہی نہیں۔ اچھا آگے پڑھو۔

الرحمٰن الرحيم، مالك يوم الدين

یعنی وہ رحمان ہے اور رحیم ہے اور روز جزا کا مالک ہے۔

کیا تم نے کبھی غور کیا کہ وہ کس طرح مخلوق پر محبت اور شفقت نچھاور کرتا نظر آتا ہے؟ مخلوق کی بات سنتا ہے، ان کی غلطیوں پر تحمل سے پیش آتا ہے، ان کی خطاؤں سے درگذر کرتا ہے، نیکو کاروں کی قدردانی کرتا ہے اور اپنی حکمت کے تحت انہیں بے تحاشا نوازتا دکھائی دیتا ہے۔

کیا تم نے محسوس کیا کہ ایک بندہ جب مشکل میں گرفتار ہوتا ہے تو وہ شفیق خدا کیسے اس کے لیے سلامتی بن جاتا ہے، اسے اپنی پناہ میں لے لیتا ہے، مشکلات میں آگے بڑھ کر اس کی مدد کرتا ہے اور گھٹا ٹوپ اندھیروں میں ہدایت کا نور بن جاتا ہے۔ کیا تم نے خود کو تصور میں اس کے

سامنے جوابدہ کھڑا پایا؟

نہیں حضرت! یہ تو میں نہیں کرتا...... تو تم نے پھر اس آیت کی کیا تلاوت کی؟ اچھا آ گے سناؤ......

ایاك نعبد و ایاك نستعین

ہم تیری ہی عبادت کرتے اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔

کیا ایسا نہیں کہ تم اپنے نفس کی عبادت کرتے ہو؟ اسی کے لیے صبح اٹھتے اور رات کو سوتے ہو؟ اسی کی خواہشات کو پورا کرنے میں نمازوں سے غافل رہتے، مال سے محبت کرتے، کمزوروں کو کچلتے اور طاقتور سے ڈرتے ہو؟ اگر ایسا ہے تو تم نے خاک اس آیت کو پڑھا۔ آ گے پڑھو۔

اھدنا الصراط المستقیم۔ صراط الذین انعمت علیھم
غیر المغضوب علیھم و لا الضالین

ہمیں سیدھا راستہ دکھا۔ ان لوگوں کا جن پر تو نے اپنا کرم فرمایا۔ ان کے راستے پر نہیں جن پر تو نے اپنا غضب نازل کیا اور نہ ہی گمراہوں کے راستے پر۔

اچھا تو کیا کبھی تم نے یہ جاننے کی کوشش کی کہ تم جس راستے پر ہو وہ درست ہے یا غلط؟ جو عقائد تمہارے والدین نے سکھائے کیا انہیں سمجھنے کے لیے کوئی تگ و دو کی؟ کیا تم نے معلوم کیا کہ خدا کا پسندیدہ راستہ کون سا ہے؟ وہ کون لوگ ہیں جن پر اس کا غضب نازل ہوا اور وہ کون لوگ ہیں جو گمراہ ہیں؟۔ نہیں حضرت! میں نے تو ان میں سے کوئی عمل نہیں کیا۔ تو بس پھر تم نے سورہ فاتحہ نہیں پڑھی۔ بزرگ نے اسے جواب دیا اور اپنی راہ ہو لیے۔ اس نے پہلے پشیمانی سے اپنا سر جھکا لیا۔ کچھ دیر بعد اس نے سر اٹھایا اور اس عزم سے اٹھایا کہ اب اس نے سورہ فاتحہ پڑھنی ہے۔ کیا آپ نے سورہ فاتحہ پڑھی ہے؟

فرح رضوان

ہمارا سفر کیوں کر شروع ہو

اللہ تعالیٰ بار بار کچھ قیمتی دن بھی ہم عادی مجرموں کو نیکی کرنے اور گناہوں سے بچنے کا عادی بنانے کے لیے بھیجتے ہیں۔ ہم گناہوں کی دلدل میں پڑے، شیطان کے مایوسی، ڈپریشن، لذت گناہ اور کم ہمتی کی ڈوریوں سے بنے جال میں اللہ کی رحمت سے دوریوں کا شکار ہونے کو ہوتے ہیں کہ رمضان اپنی پوری آب و تاب سے ہم پر چھا جاتا ہے۔ تب ہم شیطان کے مکر کے جال کو مکڑی کے جالے کی طرح آن واحد میں توڑ پھینکنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

نیک بننے کی خوب پریکٹس کرتے ہیں اور دل سے توبہ بھی کرتے ہیں- عید کے بعد شوال کے روزے بھی ہوتے ہیں۔ دھیرے دھیرے وعدے بھولنے لگتے ہیں کہ حج کا موسم، ذوالحجہ کے قیمتی دن آجاتے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ سالہا سال کی زندگی اور بار بار آتے قیمتی ایام ملنے کے باوجود بھی۔ آخر ہمارا عادی مجرم سے متقی بننے کا سفر کیوں شروع نہیں ہو پاتا؟

آپ دن میں کتنے برتن توڑ کر پھینکتے ہیں؟ نہیں؟ یہ کیسے ممکن ہے؟ کھانا تو بار بار کھاتے ہوں گے؟ تو؟ اچھا دھو لیتے ہیں گندے برتن کو۔ مگر سوچیں کہ اگر ہم یہ نہ کرتے اور ہر کھانے کے بعد میلے ہو جانے والے برتنوں سے مایوس ہو کر ان کو پھینک دیتے تو سب کچھ کما کما کر بس اسی پر گنوا دیتے اور ساتھ ہی زمین پر ہمارے رہنے کی کوئی جگہ بھی باقی نہ رہتی۔ تو آخر ہم گناہ کر کے خود کو میلا کر لینے کے بعد اللہ تعالیٰ کی رحمت سے کیوں اتنا مایوسی کا شکار ہو جاتے ہیں؟ کہ گویا اب ہم پاک ہی نہیں ہو سکتے یا یہ کوئی بہت ہی طویل پراسیس ہو۔

کیسی کیسی ناسمجھی میں مبتلا ہو کے اپنا آپ گنواتے ہیں کہ میں تو گناہ گار ہوں دعا کیسے کروں۔ نماز کیسے پڑھوں۔ نیک عمل کیسے کروں؟ قرآن کیسے پڑھوں۔ قرآن فون میں نہیں رکھتے کہ بے حرمتی ہوتی ہے۔

یقین کریں کہ قرآن کو نہ پڑھنا، نہ سمجھنا بھی اس کی بے حرمتی ہے، ورنہ تو جیسے ایک حافظ کے ذہن میں قرآن محفوظ ہوتا ہے اور وہ واش روم بھی جاتا ہے اور نارمل زندگی بھی گزارتا ہے، اسی طرح آپ خواہ کہیں بھی جائیں، فون کے کسی فولڈر یا کسی ایپ میں قرآن بھی بالکل محفوظ رہتا ہے کوئی بے حرمتی نہیں ہوتی۔ اسی طرح قرآن کو پڑھتے ہوئے وضو کا ہونا اچھی بات ہے لیکن فرض یا واجب ہرگز نہیں، اور جہاں تک چھونے کا معاملہ ہے تو پیپر پر لکھے ہوئے قرآن کے ٹیکسٹ کو بغیر وضو کے نہ چھوئیں باقی کسی بھی طرح بیشک شروع میں تین، پانچ یا سات آیات ہی پڑھنے سے ابتدا تو کریں۔

دوسری گتھی یہ ہے کہ قرآن درست پڑھنا نہیں آتا، تو گناہ ہوگا کا اتنا وہم! حالانکہ اس قدر آسان سا حل ہے کہ آپ کے فون میں، ٹیبلٹ پر کسی بھی ویب سائٹ پر بہت آسان بالکل فری سہولت موجود ہے کہ جو آیت یا لفظ آپ چاہیں وہ کسی بھی پسند کے قاری کی آواز میں سنیں اور دہرا کر خود کو درست کرلیں اور ساتھ دوہرا اجر بھی پائیں۔

قرآن سمجھ میں نہیں آتا یہ دوسرا مسئلہ ہے، لیکن کوئی بات نہیں دعا اور کوشش سے یہ بھی حل ہو جاتا ہے مگر یہ کوئی وجہ نہیں قرآن نہ پڑھنے کی۔ کیا آپ کو بخار یا سر درد ہوتا ہے تو آپ دوا کے اجزا اور ان کے تناسب کے علم پر عبور حاصل کرنے میں جان ہلکان کرتے ہیں یا بس ایکسپائری ڈیٹ دیکھ کر دو گھونٹ پانی کے ساتھ اسے حلق سے اتار لیا کرتے ہیں؟ تو بس فی الحال صرف اتنا ہی وقت، جتنا دو گولی ڈسپرین کو گھلنے میں لگتا ہے، کم از کم اتنا تو ضرور ہی قرآن پڑھنے کے لیے لگائیں، کیونکہ جس طرح ہر چیز کی ایک ایکسپائری ڈیٹ ہوتی ہے، ہر انسان کی بھی ہوتی ہے۔ اور جس طرح بہت سی چیزیں ایکسپائری ڈیٹ کے بعد بھی بظاہر اچھی بھلی دکھائی دیتی ہیں ایسے ہی انسان بھی بظاہر جی تو رہا ہوتا ہے مگر اس کا ذہن کچھ بھی سمجھنے سے قاصر ہو جاتا ہے۔ ذہنی طور پر درست ہو تب بھی دل پر مہر لگ جاتی ہے، نہ اندر کا گند باہر نکل پاتا ہے نہ ہی باہر سے کوئی صاف

شے اندر جا پاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ''ارذل العمر'' سے محفوظ رکھے آمین۔

اور اب ایک آخری سوال کہ دل نہیں چاہتا، سمجھ نہیں آتا، وقت نہیں ملتا لیکن پھر بھی ہم قرآن کیوں پڑھیں؟ اس کا جواب انتہائی طویل ہے۔ مگر کیونکہ ہمیں تو ابھی بس کچھ وقت ہی دینے پر خود کو راضی کرنا ہے تو بس اتنی سی بات سمجھ لیں کہ، قرآن پاک میں ہی اللہ تعالیٰ نے وارننگ دی ہے کہ جو قرآن سے اعراض برتے گا اللہ تعالیٰ اس کی معیشت تنگ کر دے گا۔ اور بزرگوں کا کہنا ہے کہ یہ معیشت والی بات صرف دو دن کی دنیا کی دو وقت کی روٹی کی نہیں بلکہ مرنے کے بعد، حشر کے روز، اور اس کے بعد ہمیشہ ہمیشہ کی زندگی میں معیشت کی تنگی کی بات ہے۔ آخرت کے محل، انعامات آسائشات سبھی کچھ اس ایک لفظ ''معیشت'' میں شامل ہے۔ آج اس دنیا میں ہی گھر، سواری، عزت، خوشی، سکون، بےفکری آخر کیا مل سکتا ہے فقط ایک ''معیشت'' کی تنگی کے بعد؟

ہم سمجھتے ہیں کہ ذکر اور قرآن سے جڑے رہنا صرف بے حد متقی لوگوں ہی کی تقدیر ہے حالانکہ یہ اصل میں تدبیر کا معاملہ ہے، لیکن تدبر کا وقت ہے کس کے پاس؟

اگر اب بھی اس ذات سے گناہ بار بار ہوتے ہیں، ہر اگلے قدم پر یہ وسوسہ جان چھوڑ کر نہیں دیتا، تو کسی دو تین بچوں کی ماں کی زندگی پر غور کریں کہ دن رات بچوں کے گندے ڈائپر بدلتے اس کے ہاتھ سینکڑوں بار گندے ہوتے ہیں، تو کیا ہوتا ہے؟ وہ ہر بار ہاتھ دھوتی ہے اور انہی ہاتھوں سے کھانا کھاتی بھی ہے پکاتی بھی ہے اور کھلاتی بھی ہے، بس یہی گناہوں کا بھی حل ہے کہ جوں ہی ہوں توبہ کریں اور نیکی پر پلٹ آئیں۔ سوچنے والی بات ہے نا کہ ہم سب آئے دن دیکھتے ہیں کہ ناممکن لگنے والے کام کس قدر آسانی سے ہوتے چلے جاتے ہیں، کبھی ذرا سی کوشش سے کبھی کسی کے ساتھ دینے سے، کبھی کسی کے ساتھ رہنے سے، تو بس دعا، کوشش، اچھی صحبت کو اختیار کیجیے ان شاء اللہ آسانیاں میسر ہونگی۔

سوال و جواب

ابو یحییٰ

حضرت ابراہیم کی اپنے بیٹے کی قربانی پر کانٹ کا اعتراض

سوال:

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

فیس بک پر ایک جگہ پڑھا کہ کانٹ نے حضرت ابراہیم پر یہ اعتراض کیا ہے انھوں نے اپنے بیٹے کی قربانی پیش کرکے انسانوں کے حوالے سے عاید اخلاقی ذمہ داری کو پامال کیا ہے۔ بعض لوگوں نے اس اعتراض کا جواب دینے کی کوشش کی ہے لیکن وہ اپنی قوالی پر خود ہی دھمال ڈالنے والی بات ہے۔ مطلب یہ ہے اصل اعتراض کا ایک غیر متعلق جواب دے کر خود ہی واہ واہ کرکے مطمئن ہو جانے والا معاملہ ہے۔ اصل اعتراض تو پوری قوت سے اپنی جگہ باقی رہتا ہے۔ کیا آپ کے پاس کانٹ کے اس اعتراض کا کوئی جواب ہے؟ مزید یہ کہ مولانا اصلاحی نے کانٹ کے اعتراض کا جواب دیتے ہوئے یہ کہا ہے کہ حضرت ابراہیم سے ایک لغزش کا ارتکاب ہو گیا تھا۔ کیا اصلاحی صاحب نے واقعی ایسا کہا تھا؟ سمیع علی

جواب:

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اپنی قوالی پر خود ہی دھمال ڈالنا اپنے غصے کے اظہار کے لیے ایک اچھی ادبی تعبیر ہو سکتی ہے، لیکن میری درخواست ہے کہ اس طرح کی چیزوں سے بچیں۔ آپ کو غصہ اگر آیا ہے تو صبر سے کام لیجیے۔ اس سے اللہ کی رحمت آپ کی طرف متوجہ ہوگی۔ اس طرح کی تعبیرات سے غصہ تو نکل جاتا ہے لیکن نفس کی اچھی تربیت نہیں ہو پاتی۔ اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ انسان اللہ

تعالیٰ کے قرب کے مواقع گنوا دیتا ہے۔

اس کے بعد آئیے آپ کے دونوں سوالوں کی طرف تو ان دونوں کے جواب میں یہی عرض کیا جا سکتا ہے کہ سبحانك هذا بهتان عظيم ۔ نہ حضرت ابراہیم نے کسی اخلاقی ذمہ داری کو پامال کیا تھا نہ مولانا اصلاحی نے ان پر کسی لغزش کے ارتکاب کی نسبت کی تھی۔ ہم ان دونوں باتوں کی تفصیل ذیل میں کر دیتے ہیں۔

کانٹ کا حضرت ابراہیم پر جو اعتراض ہے وہ اصلاً بائبل سے پیدا ہونے والی مسیحی اور یہودی فکر پر ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ بائبل سے جب اس واقعے کو پڑھا جاتا ہے تو حضرت ابراہیم کی عظمت تو دور کی بات ہے، ان کے بارے میں اس طرح کے سوال ضرور پیدا ہو جاتے ہیں جو کانٹ نے کیے ہیں۔ اب یہ دیکھیے کہ بائبل میں اس واقعے کی کیا تفصیل ہے۔ وہاں بیان ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کو حکم دیا کہ اپنے بیٹے کی قربانی پیش کریں۔ چنانچہ وہ بیٹے کو لے کر ساتھ چلے، مگر اسے یا اپنے خدام کو ہوا تک نہیں لگنے دی کہ کیا کرنے جا رہے ہیں۔ بیٹے نے پوچھا بھی کہ قربانی کے لیے جانور کہاں ہے تو اسے یہ جھوٹ بول کر مطمئن کر دیا کہ خدا قربانی کا جانور خود ہی مہیا کر لے گا۔ پھر قربان گاہ پہنچ کر قربانی سے قبل اپنے بیٹے کو باندھ دیا۔ (غالباً اس اندیشے سے کہ بیٹا چھری دیکھ کر بھاگ نہ جائے۔)

مجھے یہ بتائیے کہ اس طرح کے بیان پر اگر کانٹ نے اعتراض کیا تو کیا غلط کیا۔ یہ بیٹے کی قربانی نہیں، اسے قتل کرنے کا عمل ہے۔ لیکن وہ قرآن مجید کو خالی الدماغ ہو کر پڑھ لیتا تو اسے معلوم ہو جاتا کہ وہاں تو ایک بالکل دوسری بات کہی گئی ہے۔ وہاں پہلی بات یہ کہی گئی ہے کہ جب سیدنا ابراہیم نے یہ خواب دیکھا تو سب سے پہلے اسے اپنے بیٹے کے سامنے رکھ کر اس کی رائے پوچھی۔ عظیم باپ کے عظیم فرزند نے جواب دیا کہ آپ کو جو حکم دیا گیا ہے اس کی تعمیل کیجیے، مجھے آپ انشاء اللہ صبر کرنے والوں میں پائیں گے۔ قرآن ان دونوں کے رویے کو اس طرح بیان

کرتا ہے کہ فلما اسلما یعنی جب ان دونوں نے سر تسلیم خم کر دیا۔یعنی یہ معاملہ دونوں ہستیوں کی مکمل مرضی،شعوراور بندگی کےاحساس کے ساتھ رونما ہوا تھا۔

اب بتائیے کہ حضرت ابراہیم پر کیا اعتراض باقی رہا۔انھوں نے کوئی زبردستی نہیں کی۔ بیٹے کو پوری طرح اعتماد میں لیا۔ یہی بیٹے کے حوالے سے ان پر عاید ہونے والی واحد اخلاقی ذمہ داری تھی جو انھوں نے پوری کی۔اس کے بعد تو بیٹا پوری طرح باپ کے ساتھ شریک تھا۔اسی لیے اجر میں بھی باپ کے ساتھ شریک ہوا۔

یہی قرآن مجید کی عظمت ہے کہ وہ نبیوں کے نام پر موجود ہر چیز پر قیامت تک کے لیے حجت ہے۔وہ میزان یا ترازو ہے جس پر رکھ کر ہر مذہبی چیز کو تولا جائے گا۔وہ فرقان یا کسوٹی ہے جس پر انبیا سے منسوب ہر بات کو پرکھا جائے گا۔جو اس میزان پر پورا اترا اور اس فرقان میں کھرا نکلا وہی قابل قبول ہے۔اور اس میں کوئی قابل اعتراض بات نہیں ہوسکتی۔یہی حقیقت اس واقعے میں بھی نمایاں ہوتی ہے۔

جہاں تک اصلاحی صاحب کا تعلق ہے تو اس حوالے سے ان کا وہ نوٹ پڑھ لیجیے جو انھوں نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے۔اس آیت کی تفسیر میں وہ لکھتے ہیں۔

قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْ يَا۔ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں کہ خواب میں جو کچھ دکھایا جاتا ہے وہ محتاج تاویل وتعبیر ہوتا ہے۔حضرت ابراہیم کو یہ خواب جو دکھایا گیا اس کی اصل تعبیر یہ تھی کہ وہ اس بیٹے کو خدا کی نذر کر دیں۔یہ مقصود نہیں تھا کہ اس کو وہ فی الواقع ذبح کر دیں۔چنانچہ جب وہ بیٹے کو قربان کرنے کے لیے تیار ہو گئے تو خواب کا جو اصل منشاء تھا وہ پورا ہو گیا اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کو بشارت دے دی کہ خواب کا مقصد پورا ہو چکا اب مزید کسی اقدام کی ضرورت نہیں ہے۔جن لوگوں نے اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا حکم عمل سے پہلے ہی منسوخ کر دیا انھوں نے ایک غیر ضروری تکلف کیا ہے۔صحیح تاویل واضح ہو جانے کے بعد اس کی تردید کی

ضرورت باقی نہیں رہی۔(تدبر القرآن 486/6)

اس نوٹ کو پڑھ کر اگر کوئی یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ حضرت ابراہیم سے ایک لغزش کا ارتکاب ہو گیا تھا تو سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسے لوگوں کی دیانت پر کیا تبصرہ کیا جائے۔اس آیت کے ضمن میں جو بات اصلاحی صاحب نے نمایاں کی ہے وہ یہ ہے کہ خواب محتاج تاویل وتعبیر ہوتا ہے۔لیکن حضرت ابراہیم نے تو یہ کام سرے سے کرنے کی کوشش ہی نہیں کی ، بلکہ حکم کو بعینہٖ پورا کیا۔اسی لیے وہ محسن قرار پائے۔لیکن اس پر تبصرہ کرنے سے پہلے وہ آیت کے تحت اللہ تعالیٰ کی مرضی ومنشا کا بیان کرتے ہیں کہ خواب کی اصل تاویل کیا تھی جو قرآن مجید کے دیگر مقامات اور بعد کی تاریخ سے بالکل واضح ہے۔ وہ یہ تھی کہ حضرت اسماعیل کو حرم کی خدمت کے لیے عرب کی بے آب و گیاب وادی میں بسا دیا جائے۔شام وفلسطین کی جنت کو چھوڑ کر اُس دور میں اپنے بیٹے کو مکہ میں بسانا مجازی طور پر اسے ذبح کر دینے کے مترادف ہی تھا۔یہی اس خواب کی اصل تعبیر تھی۔مگر حضرت ابراہیم نے کسی تاویل اور تعبیر کی سرے سے کوشش ہی نہیں کی۔ بلکہ خواب پر بعینہٖ عمل کر ڈالا۔اس پر قرآن تبصرہ کرتا ہے کہ ابراہیم تم نے تو خواب ہی سچ کر دکھایا۔(لیکن جب یہ ہی کر دیا ہے تو یہ احسان کا آخری مقام ہے اور اس کے بعد ہم اب جو تمھیں دیں گے وہ کبھی کسی کو نہیں دیا۔) ہم محسنین کو ایسے ہی بدلہ دیا کرتے ہیں۔ یہ بریکٹ کے جملے لما کا جواب ہیں جو بر بنائے فصاحت حذف کر دیے گئے ہیں۔

یہ آیت کا مفہوم ہے۔ اصلاحی صاحب نے حضرت ابراہیم کی طرف کسی قسم کی لغزش یا تعبیری غلطی کو منسوب نہیں کیا۔ بلکہ جس طرف اشارہ کیا ہے وہ یہ ہے کہ حضرت ابراہیم نے خواب کی تعبیر کرنے یا تاویل کر کے کوئی رعایت حاصل کرنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ان کے رویے پر تبصرہ اصلاحی صاحب آیت کے اگلے حصے کی شرح میں کر رہے ہیں۔ یہاں دیکھیے وہ کیا لکھتے ہیں۔

كَذٰلِكَ نَجۡزِى الۡمُحۡسِنِيۡنَ سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ جو لوگ اللہ کے صدق و اخلاص اور اس کے احکام کی تعمیل کے باب میں احسان کی روش اختیار کرتے ہیں، یعنی ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ خدا کے ہر حکم کی تعمیل اس طرح کریں جس طرح اس کے کرنے کا حق ہے، ان کو اللہ تعالیٰ یہ صلہ دیتا ہے کہ وہ اس کے بڑے بڑے امتحانوں میں شان دار کامیابیاں حاصل کرتے ہیں اور پھر اس کے صلے میں آخرت کی ابدی بادشاہی کی فیروزمندیاں پاتے ہیں۔ برعکس اس کے جن لوگوں کی روش دین کے معاملے میں فرار پسندانہ رہتی ہے وہ آہستہ آہستہ خدا کی آزمائشوں کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت سے بالکل محروم ہو جاتے ہیں جس کا نتیجہ بالآخر یہ ہوتا ہے کہ آخرت کی کامیابیوں کی راہ ان کے لیے بالکل ہی بند ہو جاتی ہے، (ایضاً)۔

خود بتایئے یہ کسی محسن کی جزا کا بیان ہے یا پھر کسی کی لغزش پر تبصرہ ہو رہا ہے۔ باقی آپ اطمینان رکھیے، اصلاحی بھی سیدنا ابراہیم کے پیرو ہیں۔ ابراہیم کے ہر پیرو کو حق پر چلنے کی وہ قیمت دینا پڑے گی جو حضرت ابراہیم نے دی۔ نمرود سے لے کر کانٹ تک اور سرکار دو عالم پر دشنام طرازی کرنے والوں سے لے کر آج کے فرقہ پرستوں تک سب اپنے اپنے راستے پر چل رہے ہیں۔ آل ابراہیم اپنے راستے پر چل رہے ہیں۔ روز قیامت سب اپنے اپنے اماموں کے ساتھ اللہ کے حضور پیش ہوں گے اور زبان و قلم سے نکلے ہوئے ہر لفظ کا حساب دے رہے ہوں گے۔ یہ حساب کتنا خوفناک ہوگا، لوگوں کو یہ اگر سمجھ آ جائے تو بہت سے لوگ لکھنا اور بولنا چھوڑ دیں گے۔

والسلام

بندہ عاجز

ابویحییٰ

چودہ سالہ بیٹے کا قتل

سوال:

السلام علیکم، سر ابو یحییٰ!

حضرت ابراہیم کے حوالے سے آپ کی پوسٹ پر درج ذیل دو سوالات کیے گئے ہیں۔ قارئین کی درخواست ہے کہ مہربانی کر کے ان کا جواب دے دیں۔

1۔اس سب میں کانٹ کے اشکال کا جواب کہاں ہے؟ معلوم ہوتا ہے صاحب پوسٹ کو کانٹ کے فلسفہ اخلاق اور اس سے برآمد ہونے والے اشکال کی نوعیت کی بابت خبر نہیں۔ خیر اسے چھوڑیئے ایک طرف کہ یہ مستقل مضمون ہے، کیا ایک تیرہ چودہ سال کے بیٹے کو پوچھ کر اسے قتل کرنے کا ارادہ و کوشش کرنا اخلاقاً درست ہوگا؟ کانٹ کے فلسفہ اخلاق میں بھی اس بات کی کوئی اہمیت نہیں کہ انہوں نے بیٹے سے پوچھا تھا یا نہیں۔

2۔پھر کیا یہ بات درست نہیں کہ اصلاحی صاحب کے یہاں اس مقام پر ''عنداللہ'' اور ''عندالرسول'' مراد میں فرق تھا؟ اگر ہاں، تو اسے تعبیری لغزش کے سوا اور کیا کہا جائے؟

جواب:

کانٹ کا فلسفہ اخلاق کیا ہے اور اس کے اشکال کا کتنا جواب قرآن مجید کی بات میں ہے، وہ تو یہ فقیر اس وقت بتائے گا جب یہ سوال کانٹ کا کوئی نمائندہ اس سے پوچھے گا۔ سر دست تو یہ عاجز صرف سائل کے سوال کے جواب تک خود کو محدود رکھے گا۔ سوال یہ ہے کہ کیا ایک تیرہ چودہ سال کے بیٹے کو پوچھ کر اسے قتل کرنا اخلاقاً درست ہوگا؟ جواب یہ ہے کہ قرآن مجید اس معاملے کو کسی تشریعی امر کے طور پر پیش نہیں کر رہا کہ اخلاقیات کا کوئی سوال پیدا ہو۔ یہ ایک نبی کے ذریعے سے سرانجام پانے والا تکوینی معاملہ تھا۔ تکوینی معاملات رب العالمین کی قدرت و حکمت کا ظہور

ہوتے ہیں۔ اس تکوینی پہلو سے، مثال کے طور پر، صبح وشام دنیا میں معصوم لوگ مرتے ہیں۔ ان سے بغیر پوچھے ان کی جان لے لی جاتی ہے۔ کوئی اخلاقی مسئلہ پیدا نہیں ہوتا۔ ہاں قرآن کی روشنی سے محروم کچھ فلسفی سوالات ضرور اٹھاتے ہیں۔ اس عاجز نے اپنی متعدد تصانیف میں ان فلسفیوں کے سوالات کے جوابات قرآن مجید کی روشنی میں دیے ہیں۔ مگر قرآن مجید کا کوئی مومن ان تکوینی معاملات پر سوال نہیں اٹھا سکتا۔

یہی اصل چیز ہے جو قرآن یہاں بیان کررہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کو ان کی امت میں جاری کرنے کے لیے کوئی تشریعی حکم نہیں دیا تھا۔ یہ خواب کے ذریعے سے دکھایا جانے والا ایک امر الٰہی تھا۔ پیغمبر ہونے کی بنا پر وہ خود اس تکوینی امر میں آلہ کار بننے کے لیے تیار تھے۔ لیکن بیٹے کی منشا پوچھنا اس لیے ضروری تھا کہ فیصلے کا نفاذ اس پر ہونا تھا۔ اس لیے یہ ان کی اخلاقی ذمہ داری تھی کہ بیٹے کے سامنے بات رکھ دی جاتی۔ نبی اللہ کے نبی بیٹے نے جو نبوت سے قبل بھی صدیق تھا، ان کے خواب کو خدا کا حکم سمجھا۔ اور اس کے حکم کے سامنے جان دینے کو دل وجان سے قبول کیا۔

یہیں سے اس مسئلے کے ممکنہ انسانی پہلو کو بھی سمجھ لینا چاہیے۔ انسانی جان پر دو بنیادی اور ایک ثانوی اخلاقی حق قائم ہوتا ہے۔ ایک زندگی دینے والے خدا کا، دوسرا اس شخص کا جس کو زندگی دی گئی ہو۔ تیسرا حق ولی کا ہوتا ہے۔ اس خاص معاملے میں خدا کا فیصلہ باپ نے سنا دیا تھا اور اپنا حق بیٹے نے خود چھوڑ دیا۔ باپ خود ہی بیٹے کا ولی تھا اور اللہ کے سامنے پہلے ہی سر تسلیم خم کر چکا تھا۔ اس کے بعد کسی اور کی کیا حیثیت ہے کہ وہ پیغمبر علیہ السلام پر انسانی یا اخلاقی پہلو سے سوال اٹھائے؟

تاہم اس بحث سے قطع نظر ایک اور پہلو بہت اہم ہے۔ وہ یہ کہ اگر سائل کے سوال کو لے کر اس کے بارے میں یہ گفتگو کر دی جائے کہ اس نے پیغمبر علیہ السلام کو قتل کا مجرم ٹھہرا دیا ہے۔ پیغمبر

کو اخلاقی طور پر غلط کاموں میں مبتلا قرار دے دیا ہے، اس نے وحی الٰہی پر اعتراض کر دیا ہے تو ہمارے اس رویے کو بدنیتی کے سوا کیا نام دیا جائے گا۔ اس بدنیتی کے ساتھ کسی بھی عالم، محقق، مفسر کو کفر، گستاخی، شرک، تجدد پسندی، بدعت غرض ہر دینی جرم کا مرتکب ٹھہرایا جا سکتا ہے۔ شرط یہ ہے کہ کہنے والا نکتہ آفرینی کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

یہیں سے یہ عاجز سائل کے دوسرے سوال کی طرف آتا ہے۔ یعنی سائل کے نزدیک اصلاحی صاحب کے یہاں اس مقام پر ''عنداللہ'' اور ''عندالرسول'' مراد میں فرق تھا اور اسی لیے ان کے نزدیک اصلاحی صاحب نے ابوالانبیاء کو تعبیری لغزش کا مرتکب قرار دیا ہے۔ اللہ اکبر۔ اللہ اکبر۔ یہ کیا رویہ ہے؟ اصلاحی صاحب نے کس مقام پر میرے آقا ابراہیم علیہ السلام کے حوالے سے کسی تعبیر یا سوئے تعبیر کا ذکر کیا ہے؟ اس خاکسار نے اصلاحی صاحب کا پورا نقطہ نظر جو سلیس اردو میں لکھا ہوا تھا بیان کر دیا تھا۔ اس کے بعد بھی بلا دلیل ایک سوال اٹھا دینا نکتہ آفرینی کے سوا کیا ہے۔ مگر یہ کر دیا ہے تو پڑھیے اصلاحی صاحب کیا لکھتے ہیں۔

اگرچہ یہ ہدایت خواب میں ہوئی تھی اور خواب کی بات محتاج تاویل و تعبیر ہوتی ہے اس لیے حضرت ابراہیمؑ چاہتے تو اس کی کوئی تاویل کر لیتے لیکن وہ ایک صداقت شعار اور وفادار بندے تھے اس وجہ سے اس کی کوئی تعبیر نکالنے کے بجائے وہ اس کی من و عن تعمیل کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ (485/6)

اصلاحی صاحب عندالرسول تعبیر بیان نہیں کر رہے۔ یہ کہہ رہے ہیں کہ آقا ابراہیم نے من و عن حکم کی تعمیل کر دی تھی۔ یہ بیان تعبیر نہیں ہے، ان کا بیانِ اسلام ہے، امتثال امر کی وضاحت ہے۔ اطاعت الٰہی کے جذبے کا بیان ہے۔

میں اس گفتگو کو مزید طول نہیں دینا چاہتا۔ نہ آئندہ اپنے اُس قلم کو اہل علم کے دفاع کے لیے فارغ کرنا چاہتا ہوں جو شیطان کے خلاف لڑ رہا ہے۔ اس لیے بڑے اہل علم پر اس طرح کی تہمتیں لگانے والے تمام لوگوں سے دو چار گزارشات ہیں۔ ایک یہ کہ اگر آپ لوگ سلیس اردو

میں لکھی ہوئی عبارتیں نہیں سمجھ سکتے، اور کسی کا نقطہ نظر پوری طرح سمجھنے کے لیے نہ اس کی کتاب کھول کر دیکھنے کا وقت ہے، نہ خالص فنی چیزیں سمجھنے کی صلاحیت تو اللہ کے بندو! آپ سے کس نے کہا ہے کہ اتمام حجت، قطعی الدلالۃ اور ان جیسے دیگر انتہائی مشکل فنی مباحث میں چھلانگ لگا دو۔ اور اگر یہ کام کرنے کا شوق ہی ہے تو کیا ضروری ہے کہ اپنے ناقص اور سطحی علم کے ساتھ بڑے اہل علم کی نیت پر حملہ کیا جائے، ان پر سنگین الزامات لگائے جائیں، ان کو متجد د اور استعمار کا ایجنٹ قرار دیا جائے۔ کیوں اپنی آخرت کو اتنا سستا بیچ رہے ہو؟ کیوں اپنی لگام شیطان کے ہاتھ میں دیتے ہو؟ کسی چیز کو غلط سمجھ کر تنقید کرنا آپ کا حق ہے۔ مگر خدارا یہ کرنے سے قبل اپنے اندر اس کام کی صلاحیت تو پیدا کریں۔ یہ کریں گے تو تنقید سے سب کو فائدہ ہوگا۔ ہمارے جیسے طالب بھی کچھ سیکھ لیں گے۔ ورنہ باخدا بہت سی تنقیدیں دیکھ کر صرف رونا آتا ہے کہ بڑے لوگ جب ہمارے جیسے چھوٹے لوگوں میں پیدا ہو جائیں تو ان کے ساتھ کیا ہوتا ہے۔

تاہم اس کے بعد بھی لوگ اپنی روش نہیں بدلتے تو ہمارا کام بس سمجھانا ہی ہے۔ جب انسان اپنا مقدمہ پیش کرنا بند کر دیتے ہیں تو فرشتے ان کا مقدمہ تیار کرنے لگتے ہیں۔ پھر یہ مقدمہ اس ہستی کی بارگاہ میں پیش ہوگا جو سب سے بڑھ کر فیصلہ کرنے والی ہے۔ اس بارگاہ میں بدنیتی کے ساتھ نکتہ آفرینی کرنا کسی کو اللہ کی پکڑ سے نہیں بچا سکتا۔ خدا کے نام پر کھڑے ہوئے کتنے ہی لوگ ہیں جو خدا کی پکڑ کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ اگر جان لیں تو لکھنا چھوڑ دیں گے۔ اگر جان لیں تو بولنا چھوڑ دیں گے۔

بندہ عاجز

ابو یحییٰ

ابو یحییٰ

مضامین قرآن (33)

دین کی بنیادی دعوت: ذات باری تعالیٰ

ہم دین کی بنیادی دعوت کے ضمن میں پہلے موضوع کا احاطہ کر چکے ہیں۔ یعنی دعوت عبادت رب۔ اب ہم اس حوالے سے دوسرے موضوع کی طرف بڑھتے ہیں۔ یہ دوسرا موضوع اللہ تعالیٰ کی ہستی کا وہ تعارف ہے جو قرآن مجید انسانیت کو کراتا ہے۔

تعارف رب

قرآن مجید انسان کو جس پروردگار کی عبادت کی دعوت دیتا ہے، اس کے بارے میں جاننا انسان کی ایک فطری خواہش ہے۔ یہ خواہش اپنی جگہ گرچہ بالکل جائز ہے، مگر اس اعتبار سے بہت نازک ہے کہ انسان اپنے مادی وجود کی بنا پر چیزوں کو مادی جسم، مادی شخصیت اور مادی خصوصیات کے ساتھ ہی سمجھنے کا عادی ہے۔ وہ چیزوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا، اپنے کانوں سے سنتا اور اپنے حواس سے انھیں اپنی عقل کی گرفت میں لیتا ہے۔ مادیت سے بلند بھی ہو جائے تو انسان ان تصورات سے باہر نکل کر نہیں سوچ سکتا جو مخلوقات کا خاصہ ہیں۔ جیسے انسان موت و حیات اور آغاز و اختتام جیسے تصور سے کبھی بلند نہیں ہو سکتا۔ اس پس منظر کے انسان کو ایک ایسے خدا سے متعارف کرانا جو نہ صرف مادی خواص سے بلند ہو بلکہ ان عوارض سے بھی بالکل منزا ہو جو مخلوقات کا عمومی خاصہ ہوتی ہیں، ایک نازک اور مشکل مرحلہ ہے۔

قرآن مجید نے انسان کی ان خلقی کمزوریوں کی بنا پر یہ راستہ اختیار کیا ہے کہ اللہ کیا ہے اور کیسا ہے جیسے سوالوں کے بجائے اللہ کیا کرتا ہے اور مخلوق سے کیسے متعلق ہوتا ہے جیسے سوالوں کا جواب

زیادہ تفصیل سے دیا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید نے تعارف رب کے حوالے سے اللہ تعالیٰ کی صفات اوراس کی سنن اور حکمتوں ہی کو اپنا موضوع بنایا ہے۔تاہم اس کے باوجود انسان کی یہ خواہش اپنی جگہ پھر بھی باقی رہتی ہے کہ وہ ذات باری تعالیٰ کو جانے اوراسے سمجھے۔ چنانچہ قرآن مجید اس سوال سے بھی مکمل پہلوتہی نہیں کرتا اوراس حوالے سے بھی کچھ بالکل بنیادی باتیں بیان کرتا ہے۔ چنانچہ اس اعتبار سے قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کی ہستی کا تعارف تین پہلوؤں سے کرایا گیا ہے۔ یعنی ذات باری تعالیٰ ، صفات باری تعالیٰ اوراس کی وہ سنن اور حکمتیں جواس کائنات میں روبہ عمل ہیں۔سب سے پہلے ہم ذات باری تعالیٰ کے حوالے سے قرآن مجید کے بیانات کی روشنی میں یہ سمجھیں گے کہ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی ذات کے حوالے سے اس کا کیا تعارف کراتا ہے۔

ذات باری تعالیٰ: غلط تصورات کی تصحیح

قرآن مجید میں ذات باری تعالیٰ کو زیر بحث لانے کی وجہ، جیسا کہ پیچھے بیان ہوئی یہ تھی کہ یہ انسانوں کی ایک فطری ضرورت ہے، لیکن اس کی ایک زیادہ اہم دوسری وجہ یہ تھی کہ انسانوں نے ہر دور میں اپنی اس فطری ضرورت کا جواب خود ہی دینے کی کوشش کی اور غلط فہمیوں اور گمراہیوں کی ایک دنیا آباد کرلی۔ان میں سب سے بنیادی غلطی یہ تھی کہ انسانوں نے اللہ تعالیٰ کو جب اپنی خلقی اور مادی محدودیتوں کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کی تو اسے اپنے جیسا بناڈالا اور لاعلمی اور جہالت میں مخلوق کی بہت سی خصوصیات اس کے حوالے سے بیان کرنا شروع کردیں۔ چنانچہ ذات باری تعالیٰ کے حوالے سے قرآن مجید کا اصل زوراس بات پرنہیں کہ اللہ تعالیٰ کیا ہیں بلکہ اس بات پر ہے کہ وہ کیا نہیں ہیں۔

خدائے سبحان، خدائے احد

قرآن مجید اس بات کو اس طرح بیان کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ پاک ہیں۔ ہر اس منفی تصور سے

جو انسانوں نے ان کے حوالے سے محض ظن وگمان اور اندازے و قیاس کی بنیاد پر قائم کر رکھا ہے۔اس کی وجہ قرآن مجید یہ بیان کرتا ہے کہ ان کی ذات کسی بھی دوسری ہستی سے ہر اعتبار سے بالکل جدا اور بلند ہیں۔وہ اپنی ذات میں بالکل یکتا، تنہا اور منفرد ہیں۔کوئی ان جیسا نہیں۔نہ وہ کسی اور کے جیسے ہیں۔اس لیے اس بات کا کوئی سوال ہی نہیں کہ ان کو کسی اور جیسا قیاس کر کے اس کی خصوصیات اللہ تعالیٰ کے حوالے سے بیان کی جائیں۔قرآن مجید ان کا دوسروں سے تعلق اس طرح بیان کرتا ہے کہ وہ خالق ہیں اور باقی تمام موجودات مخلوق ہیں۔مخلوق ہونا ایک کمتر درجہ ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ میں مخلوق کی کوئی کمزوری نہیں پائی جاتی ہے۔ہاں مخلوقات ان کی قدرت کا ظہور ہیں اور اگر مخلوق میں کوئی خوبی ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی اپنی خوبیوں کا ظہور ہے۔

چنانچہ اس پس منظر میں قرآن واضح کرتا ہے کہ کسی بھی تشبیہ، تمثیل یا استعارے سے خدا کی ذات کو سمجھایا یا سمجھا نہیں جا سکتا۔انسان جس جس تصور سے کسی مخلوق کی ذات سے واقف ہو سکتا ہے یا اسے سمجھ سکتا ہے اللہ تعالیٰ کی ذات ان تمام تصورات سے بہت بلند ہے۔مثلاً ہر مخلوق کسی نہ کسی سے پیدا ہوئی ہوتی ہے۔مگر اللہ تعالیٰ کو کسی نے پیدا نہیں کیا۔بہت سی مخلوقات اپنی نوع کی بقا کے لیے اپنے جیسے مزید وجود پیدا کرتی ہیں۔اللہ تعالیٰ کی ہستی اپنی ذات سے کسی اور کو جنم نہیں دیتی چنانچہ اس کا کوئی بیٹا اور بیٹی نہیں ہے۔مخلوقات جوڑوں کی شکل میں صنف مخالف سے مل کر مکمل ہوتی ہیں لیکن اللہ تعالیٰ اپنی ذات میں بالکل یکتا ہیں اس لیے ان کی کوئی بیوی نہیں ہے۔ مخلوق اپنی بقا کے لیے کھانے پینے کی محتاج ہوتی ہے۔اللہ تعالیٰ کی ذات کو کھانے پینے کی کوئی ضرورت نہیں۔ہر مخلوق فنا ہو جاتی ہے یا فنا کے خطرے سے دوچار رہتی ہے۔مگر اللہ تعالیٰ ہمیشہ باقی رہنے والے ہیں۔مخلوق کا کوئی نہ کوئی آغاز ضرور ہوتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے موجود ہیں۔ہر مخلوق مشکل اور کمزوری سے دوچار ہو کر کسی سہارے کی متلاشی ہوتی ہے، مگر وہ ہر

سہارے اور ساتھی کی ضرورت سے بلند ہیں۔ غرض جس جس پہلو سے مخلوق کی ہستی کو سمجھا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ ہر اس پہلو سے بالکل مختلف ہیں۔ وہ احد ہیں یعنی اپنی ذات میں یکتا اور بالکل منفرد ہیں۔ وہ الحی ہیں، اپنی ذات میں زندہ ہیں ان کو کسی نے زندگی نہیں دی۔ وہ القیوم ہیں۔ وہ اپنے وجود کی بقا کے لیے خود ہی کافی ہیں۔ وہ الغنی ہیں یعنی وہ کسی پہلو سے کسی کے بھی محتاج نہیں ہیں۔ وہ الاول ہیں یعنی وہ کبھی پیدا نہیں ہوئے۔ وہ الآخر ہیں یعنی وہ کبھی فنا نہیں ہوں گے۔ وہ الظاہر ہیں یعنی کارخانہ قدرت اپنی ہستی میں ان کے ہونے کا اظہار ہے۔ وہ الباطن ہیں یعنی جہاں کسی مخلوق کی رسائی نہیں، وہ وہاں بھی ہوتے ہیں۔

خدا کی دید اور غیب کا پردہ

خدا کو سمجھنے کے ساتھ اسے دیکھنے کی خواہش بھی انسانی طبیعت کا ایک حصہ ہے۔ اس لیے قرآن مجید نے اصول میں بھی اس کو واضح کیا کہ نگاہیں اس کا احاطہ نہیں کرسکتیں اور ایک جلیل القدر پیغمبر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعے میں تفصیل سے بھی اس کو واضح کیا کہ انسان تو کیا پہاڑ جیسی پر ہیبت مخلوق بھی اس کی تجلی کی تاب نہیں لاسکتی۔ انسانوں کو ان کے پروردگار پر ایمان کے جس امتحان میں ڈالا گیا ہے اس کی سب سے کٹھن منزل یہی ہے کہ اسے غیب میں رہتے ہوئے ایمان لانا ہوگا۔ نہ صرف ایمان لانا ہوگا بلکہ خدا کی عبادت واطاعت کی راہ میں چلنے پر جو مزاحمتیں پیش آئیں گی، ان میں اسے ثابت قدم رکھنے کے لیے سب سے بڑا سہارا یہ ہوگا کہ خدائے رحمٰن سے بن دیکھے ڈرنے والا ہو۔ خدا کبھی نظر نہیں آئے گا۔ وہ کبھی حواس کی گرفت میں نہیں آسکتا۔ وہ کبھی براہ راست محسوس نہیں ہوسکتا۔ اس لیے جسے اسے ماننا ہے بن دیکھے اور بالواسطہ شواہد کی بنیاد پر اسے مانے۔ اس کے اور انسان کے بیچ غیب کا جو پردہ حائل ہے وہ روز قیامت سے قبل نہیں اٹھ سکتا۔

خالق: مخلوق سے بالکل جدا ایک الگ شخصیت

اللہ تعالیٰ کی ذات سے منسوب کردہ یہی وہ غلط فہمیاں تھیں جنھوں نے ہر دور میں شرک کو جنم دیا اور غیر اللہ کی عبادت کے تصور کو عام کیا۔ خدا کے بیٹے، بیٹیاں، بیویاں، اوتار اور ان کے بت اسی بنیاد پر تراشے گئے۔ چنانچہ قرآن مجید نے اللہ تعالیٰ کے حوالے سے ان ساری غلط فہمیوں کو دور کر کے ان کے تصورات کی جڑ ہی کاٹ دی۔ تاہم جس طرح کچھ لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے متعلق یہ غلط فہمی لاحق ہوئی کہ وہ مخلوق جیسے ہیں اسی طرح کچھ اور لوگوں کو یہ غلطی لاحق ہوئی کہ مخلوقات اللہ تعالیٰ کی اپنی ذات کا ظہور ہیں۔ خدا پوری کائنات میں جاری وساری اور ہر شے میں موجود ہے۔ خالق ومخلوق کوئی جدا اور الگ وجود نہیں۔ اگر کوئی دوئی نظر آرہی ہے تو وہ نظر کا دھوکہ ہے یا مادیت کا فریب ہے۔ انسان قطرہ ہے اور خدا سمندر۔ اس مادی جامے میں یہ قطرہ اپنی اصل یعنی سمندر سے دور ہو چکا ہے چنانچہ اس کی زندگی کا اصل مقصد یہی ہے قطرہ سمندر سے وصال کی جستجو کرے۔ یہ تصور تمام متصوفانہ مذاہب کی بنیاد ہے۔

قرآن مجید پوری قوت کے ساتھ اس نقطہ نظر کی تردید کرتا ہے۔ قرآن مجید واضح کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات میں ایک جدا اور الگ شخصیت کے مالک ہیں۔ تمام موجودات ان کے اذن اور امر سے تو وجود میں آئی ہیں لیکن ان کی ذات کا حصہ نہیں بلکہ ان کی مخلوق ہیں۔ خدا کی ذات تو تمام مخلوقات سے جدا اور بلند ہے۔ وہ فلسفیوں اور صوفیوں کا سرائی خدا نہیں جو کائنات کی ہر چیز میں سرائیت کئے ہوئے ہے اور مخلوقات اس کی ذات کا ظہور ہیں۔

قرآن مجید پوری قوت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو ایک مشخص ہستی کے طور پر پیش کرتا ہے۔ یہ ہستی رب العالمین ہے۔ شہنشاہ کائنات ہے۔ یہی ہستی ہر چیز کو پیدا کرنے والی اور خالق موجودات ہے۔ یہ ہستی صاحب اختیار اور صاحب ارادہ ہے۔ اللہ کی ہستی کو ایک مشخص ہستی کے طور پر پیش

کرنے کے خاطر ہی قرآن مجید نے جگہ جگہ جان بوجھ کر وہ تعبیرات اختیار کی ہیں جو مخلوقات کی شخصیت کو نمایاں کرنے کے لیے استعمال کی جاتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے لیے مذکر کا صیغہ استعمال کیا جانا، اس کی طاقت کے اظہار کے لیے اس کے ہاتھ اور اس کی رضا کے لیے اس کے چہرے کی تعبیر اختیار کرنے کی اصل وجہ یہی ہے کہ اسے مخلوقات سے الگ کر کے اس کی اپنی شخصیت کو نمایاں کیا جائے۔ یہ واضح کیا جائے وہ ایک مشخص ہستی ہے نہ کہ مخلوقات کے اندر سرائیت کی ہوئی ایک روح یا توانائی جو مخلوقات کے اندر روبہ عمل ہے۔

چنانچہ یہی اللہ تعالیٰ کی ذات کا وہ تعارف ہے جو قرآن مجید میں پایا جاتا ہے۔ رب، الہ، الخالق، المالک، الملک، الحی، القیوم، الظاہر، الباطن، الاول، الآخر، الغنی اور ان جیسے دیگر اسماء خدا کی ذاتِ باکمال کا بیان ہیں۔ یہ اصلاً اس کی ہستی کا بیان ہیں۔ اس پر مزید بات آگے صفات کے بیان میں ہوگی۔

قرآنی بیانات

''یہ کتاب الٰہی ہے...... ہدایت ہے خدا سے ڈرنے والوں کے لیے۔ ان لوگوں کے لیے جو غیب میں رہتے ایمان لاتے ہیں۔ (بقرہ 2:3-2)

''اس کا معاملہ تو بس یوں ہے کہ جب وہ کسی بات کا ارادہ فرماتا ہے تو کہتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے۔ پس پاک ہے وہ ذات جس کے ہاتھ میں ہر چیز کا اختیار ہے اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔'' (یسین 36:83-82)

''اللہ ہی ہر چیز کا خالق ہے اور وہی ہر چیز پر نگہبان ہے۔'' (الزمر 39:62)

''تیرا رب، عزت کا مالک، ان باتوں سے پاک ہے جو یہ بیان کرتے ہیں۔''

(الصافات 37:180)

''تو ان سے پوچھو، کیا تیرے رب کے لیے بیٹیاں ہیں اور ان کے لیے بیٹے! کیا ہم نے فرشتوں کو عورتیں بنایا اور وہ دیکھ رہے تھے! آگاہ، یہ لوگ محض من گھڑت طور پر یہ بات کہہ

رہے ہیں کہ خدا نے اولاد بنائی ہے اور یہ بالکل جھوٹے ہیں۔''

(الصافات 149-152:37)

''تو تم اللہ کے لیے مثالیں نہ بیان کرو۔ بے شک اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔''

(النحل 74:16)

''اور انھوں نے جنوں میں سے خدا کے شریک ٹھہرائے حالانکہ خدا ہی نے ان کو پیدا کیا۔ اور اس کے لیے بے سند بیٹے بیٹیاں تراشیں، وہ پاک اور برتر ہے ان چیزوں سے جو یہ بیان کرتے ہیں۔ وہ آسمانوں اور زمین کا موجد ہے۔ اس کے اولاد کہاں سے آئی جب کہ اس کی کوئی بیوی نہیں اور اس نے ہر چیز پیدا کی اور وہ ہر چیز سے باخبر ہے۔ وہی اللہ تمہارا رب ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہی ہر چیز کا خالق ہے تو اسی کی بندگی کرو اور وہی ہر چیز پر نگران ہے۔ اس کو نگاہیں نہیں پاتیں لیکن وہ نگاہوں کو پالیتا ہے، وہ بڑا باریک بین اور بڑا باخبر ہے۔''

(انعام 100-103:6)

''اور جب موسیٰ ہماری مقررہ مدت پر حاضر ہوا اور اس سے اس کے رب نے کلام کیا تو اس نے درخواست کی کہ اے میرے رب مجھے موقع دے کہ میں تجھے دیکھ لوں۔ فرمایا تم مجھے ہرگز نہ دیکھ سکو گے البتہ پہاڑ کی طرف دیکھو، اگر یہ اپنی جگہ پر ٹکا رہ سکے تو تم بھی مجھے دیکھ سکو گے۔ تو جب اس کے رب نے پہاڑ پر اپنی تجلی ڈالی تو اس کو ریزہ ریزہ کر دیا اور موسیٰ بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ پھر جب ہوش میں آیا، بولا: تو پاک ہے، میں نے تیری طرف رجوع کیا اور میں پہلا ایمان لانے والا بنتا ہوں۔'' (اعراف 143:7)

''اس کے مانند کوئی شے بھی نہیں ہے۔'' (شوریٰ 42:11)

''اللہ ہی معبود ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ وہ زندہ ہے۔ سب کا قائم رکھنے والا ہے، نہ اس کو اونگھ لاحق ہوتی ہے نہ نیند'' (بقرہ 255:2)

''وہ کھلاتا ہے اور کھاتا نہیں''، (الانعام 14:6)

''تم اعلان کر دو کہ اللہ یکتا ہے، اللہ سب کا سہارا ہے، وہ نہ باپ ہے نہ بیٹا، نہ کوئی اس کا ہم سر ہے''، (اخلاص 112)

مبشر نذیر

ترکی کا سفر نامہ (37)

بعض صحیح احادیث میں ایک دیوار کا ذکر آیا ہے جس کے پیچھے یاجوج و ماجوج قید ہیں اور روزانہ اسے توڑنے کی کوشش کرتے ہیں اور مستقبل میں ایک دن وہ اس میں کامیاب ہو جائیں گے۔ان احادیث پر جدید دور میں یہ سوال کیا گیا ہے کہ آج کل تو روئے زمین کا چپہ چپہ سیٹلائٹ کی مدد سے چھانا جا چکا ہے۔ایسی کوئی دیوار نہیں ملی جس کے پیچھے کوئی اتنی بڑی قوم آباد ہو۔

یہ سوال دراصل ایک غلط فہمی کی بنیاد پر پیدا ہوتا ہے جو کہ اس دیوار کو حقیقی معنی میں لینے سے پیدا ہوئی۔اصل میں یہاں دیوار کو تمثیل کے اسلوب میں بیان کیا گیا تھا اور اشارہ اس بات کی طرف تھا کہ اللہ تعالی نے انہیں گویا پہاڑوں کے اندر قید کر کے سام اور حام کی نسلوں کو ان سے محفوظ کر رکھا ہے۔قرب قیامت میں یہ لوگ آزاد ہو کر روئے زمین پر قابض ہو جائیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔حافظ ابن کثیر نے بھی سورۃ کہف کی تفسیر میں اس روایت پر تنقید کرتے ہوئے یہ توجیہ پیش کی ہے کہ یہ روایت دراصل اسرائیلی روایت ہے جو سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کعب الاحبار علیہ الرحمۃ سے سنی ہو گی لیکن کسی راوی نے غلطی سے اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر دیا۔

اب یاجوج و ماجوج کو کسی دیوار کے پیچھے تلاش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔امریکیوں، روسیوں، یورپیوں اور چینیوں کی صورت میں یہ اس وقت زمین کے اطراف میں موجود ہیں۔ قرآن مجید اور بائبل کی یہ پیش گوئی پوری ہو چکی ہے۔اب ہمیں قیامت کا انتظار کرنا چاہیے اور اپنے قول و فعل کے اعتبار سے اس کی تیاری کرنی چاہیے۔

ذوالقرنین

قرآن مجید میں جناب ذوالقرنین کا ذکر آیا ہے۔ یہ ایک صاحب ایمان بادشاہ تھے جنہوں نے اپنی سلطنت کو عدل وانصاف سے بھر دیا تھا۔ ان کا ایک سفر بھی بحیرہ کیسپین اور بلیک سی کے درمیان ہوا تھا جس کے اشارات قرآن مجید میں بیان ہوئے ہیں۔ سورہ کہف (18:98-91) میں ان کا جو واقعہ بیان ہوا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ذوالقرنین کی سلطنت کے شمالی علاقے میں آباد اقوام پر اس دور میں بھی یاجوج و ماجوج حملے کیا کرتے تھے۔ بعض لوگوں نے آپ کی بنائی ہوئی دیوار کو اوپر بیان کردہ حدیث میں مذکور دیوار قرار دیا ہے جو کہ درست نہیں ہے۔ جناب ذوالقرنین کی بنائی ہوئی دیوار ساتویں صدی عیسوی تک قفقاز کے شہروں دربند اور دریال کے بیچ میں واقع تھی۔ دربند اب بھی داغستان کا ایک شہر ہے جو بحیرہ کیسپین پر واقع ہے جبکہ دریال پہاڑی سلسلہ ہے جو جارجیا اور روس کی سرحد پر واقع ہے۔ اسی سلسلے میں کہیں وہ دیوار رہی ہوگی۔ یاقوت حموی نے اس کا ذکر اپنی کتاب ''معجم البلدان'' میں کیا ہے۔ بہرحال اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔

[جاری ہے]

پروین سلطانہ حنا

غزل

جب زمین کا موسم دشتِ بے اماں ہو گا
روزِ حشر سے پہلے حشر کا سماں ہو گا

آگ و خوں کی بارش میں جان کا زیاں ہو گا
مل کے بیٹھ جاؤ تو وقت مہرباں ہو گا

ایٹمی لڑائی کو اتنا سہل مت جانو
آدمی کی بستی میں حادثہ گراں ہو گا

ذہن و دل کے خانوں کی مختلف ہیں آوازیں
اختلاف تو ہو گا آدمی جہاں ہو گا

ظلم کو مٹا ڈالو، فاختہ کو مت مارو
امن کی فضاؤں میں ورنہ پھر دھواں ہو گا

کائنات مہکے گی خوشبوؤں کی بارش سے
امن کی بہاروں کا حسن جب عیاں ہو گا

ابویحییٰ کی کتابیں

آخری جنگ

شیطان کے خلاف انسان کا اعلان جنگ

حکمت کی باتیں

حکمت کی وہ باتیں جو دنیا و آخرت میں کامیابی کی ضامن ہیں

ملاقات

اہم علمی، اصلاحی، اجتماعی معاملات پر ابویحییٰ کی ایک نئی فکر انگیز کتاب

کھول آنکھ زمین دیکھ

مغرب اور مشرق کے سات اہم ممالک کا سفرنامہ

جب زندگی شروع ہوگی

ایک تحریر جو ہدایت کی عالمی تحریک بن چکی ہے

قسم اس وقت کی

ابویحییٰ کی شہرہ آفاق کتاب ''جب زندگی شروع ہوگی'' کا دوسرا حصہ

Please visit this link to read all articles and books of Abu Yahya free online.

www.inzaar.org

To get Abu Yahya Quotes Join us on twitter:

Twitter ID: @AbuYahya_inzaar

To read Abu Yahya articles regularly Join us on Facebook

Abu Yahya Page: www.facebook.com/abuyahya.inzaar

Abu Yahya Account: www.facebook.com/abuyahya.jzsh

Join us on Youtube

Search inzaar on YouTube to see our audios and lectures

To get monthly books, CDs/USB and Inzaar's monthly magazines at home anywhere in Paksitan, contact # 0332-3051201 or 0345-8206011

To participate in online courses, visit

www.inzaar.org/online-courses/

To get any other information, email to globalinzaar1@gmail.com

Following material in audio form is available on USB/CD:

Quran Course by Abu Yahya

Quran Translation and Summary by Abu Yahya

Islahi Articles

Jab Zindagi Shuru Hogi (book)

Qasam Us Waqt Ki (book)

Aakhri Jang (book)